۲۶۶

سالنامہ

ارم

جون ۱۹۴۲ء

سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد (دکن)

قیمت عہ

ادارت

مدیرہ — شکیلہ" جی - ایم - خان

مددگار — آزاد بی - اے

ناظم — سید راشد حجازی"

مددگار نظار

محمد سعید ابراہیم — عبد الغنی طرفہ — سید مظہر الدین حسن مظہر

چندہ سالانہ — سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد دکن — للعہ چار روپیے

ترسیل زر بنام - مدیرہ صاحبہ ارم - سلطنت منزل سیف آباد - حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سالنامہ ارم

سالانہ چندہ للعہ چار روپے

جلد | فہرست مضامین ماہ جون ۱۹۴۲ء مطابق ماہ تیر ۱۳۵۱ف | سوم

شکریہ -

ایسے ناسازگار حالات کے باوجود جبکہ دنیا کا ہر شعبہ پریشانی کے عالم میں ہے -
ارم جیسے دوسالہ پرچے کے لئے اپنی سالگرہ منانا اور تمام دلکشیوں اور خوبیوں کے ساتھ منظر
عام پر آنا مشکل ہی دکھائی دیتا تھا لیکن ہمیں ان تمام حضرات کا بدل شکریہ ادا کرنا چاہیئے جنہوں
نے ہمیں تمام قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہوئے اپنے کام کو انتہائی تندہی اور خوش اسلوبی سے
انجام دیا۔

سالنامے کی تکمیل - کام کی زیادتی اور وقت کی کمی - خصوصاً حالات کا تغیر بعض اوقات
ہمیں مایوس کرتے رہے لیکن ایسے وقت میں جناب پروپرائٹر صاحب انتظامی پریس
نے انتہائی توجہ سے کتابت وطباعت کا انتظام فرما کر ہمارے کام میں بہت کچھ سہولت پیدا کر دی
ہمارے قلوب ان کے اشتراک عمل کے باعث تشکر و امتنان کے جذبات سے مملو ہیں -

ہم جناب احمد ولی الدین صاحب کاتب کو شکریئے جیسے خوشگوار وظیفے سے علیحدہ
نہیں رکھنا چاہتے - صاحب موصوف نے کاتبانہ اوصاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے -
اپنے کام کو جس جانفشانی سے انجام دیا ہے - اس کے ہم ممنون ہیں

ادارہ ان تمام حضرات کا ممنون ہے - جنہوں نے مخلصانہ جذبے کے تحت
اشتراک عمل فرمایا! -

سید راشد حجازی

ناظم ادارہ

:دب:

آج جبکہ ہماری دیارِ تمام دنیا متاثر نظر آرہی ہے۔ ہر ایک فرد کے چہرے سے ہراسانی ٹپک رہی ہے، حال "کشمکش" یا "ابتلا" ہے "مستقبل" تاریک ہے۔ ایسے عجیب اور دردناک وقت میں دماغی توازن اور دل کا سکون قائم رکھتے ہوئے سعی کرنا یعنی اپنے فعل کو صحیح طور پر انجام دینا تقریباً ناممکن نظر آرہا ہے خصوصاً بدنصیب ہندوستان جس کا ہر شعبہ تاریکی میں ہے۔ جس کی مشین کی ہر کل دوسرے ہاتھوں میں ہے۔ ایسے ملک میں بسنے والے بھلا کہاں سے لائیں گے حوصلہ اس صبر آزما وقت کی تاب لانے کا وہ ذرائع کہاں سے لائیں گے جن کو کہ کام میں لاکر اپنے خراب حالات پر قابو حاصل کر سکیں گے۔ دیگر شعبوں کی نسبت جس شعبے کی حالت زیادہ بدتر ہے وہ "معاشی" ہے۔ جس سے ہر بچہ۔ بوڑھا، جوان۔ تعلیم یافتہ، جاہل مرد و عورت متاثر نظر آرہا ہے۔

جنگ سے پیشتر بھی حالت خراب تھی۔ مگر اس قدر نہیں۔ حوصلے روز بروز پست ہوتے چلے جا رہے ہیں پریشانیاں صبر و سکون پر غالب آتی جا رہی ہیں جو فلاکت جنگ سے پیشتر خودداری نہ جدوجہد کے پردے میں مستور تھی۔ ہر صبح اس کی عریانی نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہندوستان بھی اپنے معاشی حالات کو اپنے قابو میں رکھ سکتا۔ تو ہمارے خیال میں اس کو مزید چند سال ہراساں ہونے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر ہندوستان اور اس میں رہنے والوں کی بدنصیبی ہے۔ کہ سالہا سال سے کوشش کرنے کے باوجود ہمارے سیاسی مدبر لفظ "معاشت" کو عمل کی صورت میں نہیں دیکھ سکے۔ اگر وہ اس کے لئے صحیح کوشش کرتے تو آج ملک کے بہترین دماغوں۔ قابل ترین مدبروں اور ایثار کرنے والے بہادروں سے انہیں یوں مایوس نہ ہونا پڑتا۔ آج انہیں ہر جانب مایوسی کی تاریکی نہ دکھائی دیتی

ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ہمارے معاشی حالات کے خراب ہونے کا باعث ہمارے متمول کی خود غرضی ہے۔ اور ہندوستان کی غلطی ہے کہ اوس نے یہ محسوس کیا متمول اور تدبیر چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھکر ہر فرد عمل واشتراک کا ہاتھ بڑھاتا تو آج ہمیں ہندوستان کے حالات کا نقشہ ہی دوسرا نظر آتا۔

آنے والے مرض کا تدارک اگر کرنا ہے۔ تو مرض کے حملے سے بہت پہلے کیا جاتا ہے۔ جب حملہ ہو جائے تو تیمار دار اور مریض کو سوائے صبر کے چارہ ہی کیا ہے۔

تدبر نے جنگ کی دبا کے آثار بہت پہلے دیکھ لئے تھے۔ اوس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک طرف سے طوفان عظیم اٹھا چاہتا ہے۔ جس کی زد میں بڑے بڑے قصر آجائیں گے۔ معمولی تجویزیں ایوں کی اوس کے سامنے کوئی حقیقت نہ ہوگی۔ مگر

اس نے صرف یہ کہہ کر کہ "دیکھا جائے گا" خاموش رہنا ہی مصلحت خیال کیا۔ اگر وہ ہندوستان کی معاشی حیثیت کو اسی وقت دیکھ لیتا تو آج اس کے ہمجنسوں کو جھونپڑی کے اندر بیٹھنے کے باوجود طوفان کی قیامت خیز اذیتوں کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا وہ ممالک جو اس طوفان کی زد میں آچکے ہیں جن کے قصر کی بنیادیں نازیت کے طوفان برق و باراں نے متزلزل کر دی ہیں ہمارے خیال میں وہ ایسی بری حالت میں دکھائی نہ دیں گے۔ جس حالت میں کہ اس وقت یہ ملک (ہندوستان) نظر آرہا ہے جو اس طوفان کی زد سے صحیح معنوں میں اتنا قریب نہیں ہے۔ اگر جنگ کی یہی حالت رہی تو وہ دن دور نہیں جبکہ تیر معاشرت کے زخمی تکلیف کی تاب نہ لاتے ہوئے۔ نوحہ کناں سر عام نظر آئیں۔ خودداریاں۔ مجبوریاں بن کے رہ جائیں۔ اور ملک کے بہترین دماغ پستی کی تاب نہ لاکر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں۔

اس وقت ضرورت ہے اس بات کی کہ دیگر حالات کے ساتھ ساتھ معاشی اصلاح ضروری خیال کی جائے اس سے یہ ہوگا کہ وقتی طور پر ان آفات اور خطرات کا مقابلہ آسان ہو جائے گا جو ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں اور جو روز بروز ہم سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے مدبرین اگر کوشش کریں تو معاشی مرض امراض مزید متاثر ہونے سے بچائے جا سکتے ہیں۔ ان کے تدارک کی نظریں محدود نہ ہونی چاہئیں بلکہ ان کی وسعت اتنی ہو کہ اپنے سے دور تک۔ سفید پوش مکانات کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کٹیوں میں رہنے والے معاشی زخمیوں کا بھی جائزہ لے سکیں اور ان کا علاج کر سکیں۔ اس وقت زبان کا وقت نہیں بلکہ وقت ہے عمل کا ——— فقط

شکیلہ جی۔ ایم خاں

ایسے مہیب وقت میں جبکہ ہر دماغ غیر معمولی انتشار اور اضطراب میں مبتلا ہے۔ کتابت و طباعت میں عظیم ترین مشکلات سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس خالق حقیقی کا شکریہ ہے کہ ہم ارم کے سالنامے کو جملہ صوری معنوی خوبیوں دلکشیوں سے مزین لے آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے قلوب اس خیال سے مسرور ہیں کہ ارم کی سابقہ زندگی کے مقابلے میں اس وجودہ حالت سے۔ درخشاں مستقبل اور ترقی کے واضح آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ سعی و جدوجہد کے اسی نتیجے کا نام امید لب۔ ہے جو آخر کار فتح و نصرت کا باعث بنتی ہے۔

گذشتہ دو سال کے پرچوں کو دیکھتے ہوئے۔ یہ اندازہ قطعی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ ارم بھی کبھی ملک کے رین ادبی پرچوں کی صف میں آنے کی کوشش کرے گا وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ جنگ کے طوفان نے کہنہ جرائد کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ مگر یہ سب خالق حقیقی ذات لایزال کا فضل اور احباب ادبا کی حوصلہ افزائی شتراک عمل کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے ارادوں کو عملی صورت میں لانے کے قابل ہو سکے

نیز جب انسان کسی بات کا عزم کر لیتا ہے تو وقت کے موزوں یا ناموزوں ہونیکا خیال ہی دل میں نہیں لاتا۔ بلکہ انسانی عزم و استقلال کے سامنے وقت موزوں صورت اختیار کر لیتا ہے اور صحیح ہے کہ

کام وقت کا انتظار نہیں کرتا بلکہ وقت کام کا منتظر رہتا ہے۔ کیونکہ اسکی تخلیق ہی کام کے واسطے کی گئی ہے۔

ہمارے پاس وقت کم تھا۔ ہم اپنے مرتبہ پروگرام کو مکمل نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ بعض صورتیں ایسی پیدا ہوگئیں تھیں جن کو دیکھتے ہوئے عام نظروں میں ہمارے لئے اپنے ارادوں کی تکمیل ناممکن سی دکھائی دیتی تھی لیکن خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے پیدا شدہ حالات کی جانب سے لاپرواہ ہوکر کام شروع کر دیا۔

گو ہمیں قدم قدم پر دقتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ہماری جد و جہد میں کوئی فرق نہ آیا۔ آج ہم خوش ہیں کہ ہماری کوششیں بار آور ہوئیں۔ ہم جن ادبی ہیروں کو آپ سے روشناس کر کے مسرت محسوس کر رہے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی چمک بہت سے ادب نواز احباب کی آنکھوں کو خیرہ کر چکی ہے۔ اور جو ملک، قوم و ادب کی خدمت کر کے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض ایسا ہم آپ سے تعارف کراتے ہیں۔ وہ اپنے دل میں ملک، قوم کے لئے نیز اردو ادب کے لئے کارآمد جذبہ رکھتے ہیں، وہ ادیب ہیں۔ مگر ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے ادیب کہلانے کے مستحق نہیں

اوراق ارم ہر اس ادیب کے لئے کھلے ہیں۔ جو اردو ادب کی خدمت کسی حیثیت سے بجا لانا چاہئے انشاء اللہ ہم ہر اس ادیب کو اپنی محفل میں شامل کریں گے۔ جس کے دل میں اردو ادب کی خدمت کا جذبہ موجود ہے۔

ادارہ ارم کے قیام کی غرض و غایت زیادہ تر یہی ہے کہ ادیب کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ہم بیحد قلق محسوس کر رہے ہیں کہ وقت کی کمی کی وجہ سے ہم کہنہ مشق ادباء سے استفادہ حاصل نہ کر سکے انشاء اللہ آئندہ ہم ان سب کو بزم ارم کی سرپرستی کے لئے مجبور کریں گے اور ہمیں امید بھی ہے۔ کہ ان کی نگاہ التفات کی ایک کرن ارم کی صحافتی دنیا کو منور کر دیگی۔ اور کرتی رہے گی۔ اور ہمارے لئے صراط عمل کی تاریکیوں میں راہ نما ثابت ہوگی

کام کی صحیح تکمیل مشکل ہوتی ہے۔ جب تک کہ اشتراک عمل میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ نہ ہوں اس سے تقسیم کار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کام کے ہر حصے میں تکمیل کے بعد ایک خوبی نمایاں ہوتی ہے۔ نیز اشتراک عمل ہی ایک ایسی چیز ہے جو کامیابی کا سبب بن سکتی ہے۔

چونکہ ادارے کے پیش نظر وسیع پروگرام تھا۔ جس کی تکمیل بغیر اشتراک کے نہ ہو سکتی تھی اس لئے کچھ روز قبل ایک بورڈ ترتیب دیا گیا۔ جو چار افراد پر مشتمل ہے۔ جنمیں ایک کی حیثیت ناظم کی رہے گی باقی کے سپرد ادارے کے مختلف شعبوں کی تنظیم ہو گی۔ قارئین و ہمدردان ارم انشاء اللہ بہت جلد اشتراک کا نتیجہ عمل کی صورت میں ملاحظہ فرمائینگے

ہٹلر اپنے غلام صفت دوست مسولینی کے تعاون سے سارے یورپ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے اس نے تقریباً ساری دنیا کو جنگ کی ہولناک آگ میں جھونک دیا ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ دھواں اُٹھ رہا ہے۔ تپش پھیل رہی ہے اور نازیت کے ظلم پرور ہاتھوں سے تیار کی ہوئی اس بھٹی میں ساری قومیں تپائی جارہی ہیں۔ موجودہ جنگ دراصل ایک قسم کا امتحان ہے جس میں دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں شریک ہیں۔ یہ امتحان ہے عقل و تدبر کا۔ فہم و فراست کا۔ قوت دلجمعی۔ دلیری اور استقلال کا۔ جب جنگ ختم ہوگئی۔ اور فضائے کائنات میں شعلوں کی گرمی کے بجائے امن و سلامتی کی خنکی پھیلے گی اُس وقت معلوم ہوگا۔ کہ کونسی قوم زر خالص تھی جو آگ کی اس تیزی میں اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ اور کونسی دھات پر ملمع تھا جو دو چار شعلوں ہی میں اڑ کر رہ گیا۔

ایشیا میں جاپان ہے جو اپنی طرز حکومت کے لحاظ سے کسی قدر مختلف ہے۔ لیکن اغراض و مقاصد کی روشنی میں بالکل نازیت کا مقلد ہے۔ یہ ساری ایشیا کو ہضم کر ڈالنے کا تہیہ کر رہا ہے۔ اس کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کی آوازیں اب ہندوستانی سرحدوں پر سنائی دینے لگی ہیں۔

ایک طرف یہ خونخوار قومیں ہیں جو انسانوں کی ہڈیوں سے اپنی اپنی عظمتوں کے محلات تعمیر کرنا چاہتی ہیں اور جنہیں سپاہیوں کے خون سے حکومت کی کھیتیاں سیراب کرنے کی دھن ہے۔ دوسری جانب عقلمند برطانیہ ہے متمول امریکہ ہے۔ مساوات پسند روس ہے مظلوم چین ہے۔ اور کمزور ہندوستان ہے قوتوں کا یہ تصادم جو نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے متعلق ابھی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ہماری رائے میں موجودہ جنگ انسانوں کی جنگ نہیں بلکہ اصولوں کی جنگ ہے۔ اس میں سپاہی نہیں بلکہ عقائد لڑ رہے ہیں۔

تقدیر کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ظالم نازیت کو کامیاب کردے یا امن پسند جمہوریت کے سر فتح کا سہرا باندھے۔ حالات سے جو اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ جب حرب و ضرب۔ پیکار و کارزار کی یہ آندھیاں ختم ہوں گی۔ اس وقت نازی شیطان تباہی و ناکامی کے اندھیروں میں تڑپتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اور جمہوری فرشتے دنیا میں کامیابی و مسرت کی روشنی پھیلاتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ہم نے ابھی ہندوستان کو کمزور کہا، اور کون ہے۔ جو یہاں کے حالات سے واقف ہو اور کمزور نہ کہے۔ ہمارے ملک میں مختلف فرقے ہیں۔ جن کی اپنی اپنی زبانیں ہیں۔ جداگانہ مذاہب ہیں مختلف عقائد ہیں غرض کہ اشتراک و اتحاد کے لئے کوئی بنیاد نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ ہم وطن ہیں اور انسان ہیں۔

چند روز پہلے سر کرپس ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں کچھ تجاویز لائے تھے۔ اور خیال تھا۔ کہ شاید اتحاد و حریت کی جو کوشش مدت سے جاری ہیں۔ ان کا کوئی خوشگوار نتیجہ نکلے گا لیکن۔ ان تجاویز کو ملک کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق مسترد کر دیا۔ اور ہندوستان اسی منزل پر رہ گیا۔ جہاں کہ اس سے پہلے تھا جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہو چکا ہے "ماضی" کے حسن و قبیح پر بحث کرنے کا، کوئی موقع نہیں۔ ضرورت اس کی ہے۔ کہ کسی طرح "حال" کو درست کیا جائے۔ جاپانی جنگی شرارے اب ہندوستان تک پہنچ چکے ہیں۔ اون سے بچنا اور انہیں بجھانا۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا فریضہ ہے۔

منڈالے پر قبضہ کرنے کے بعد جاپانی تقریباً تمام برما پر قابض ہو چکے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اب وہ ہندوستان کی سمت آگے بڑھیں۔ اس وقت کے لئے ہمیں تیار رہنا چاہیئے اور یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ موجودہ قیامت) میں ثابت قدم رہنا ہے ہمارے مستقبل کی تعمیری ترقی کا سبب یہی ہو سکتا ہے۔ اگر آج غفلت و کاہلی میں مبتلا رہے۔ تو کل ممکن ہی نہیں۔ یقینی ہے کہ من حیث القوم۔ ہم فنا ہو جائیں اور جو غلامی آج ہمارے لئے تکلیف دہ ہے۔ کل اس سے بھی زیادہ حقارت آمیز غلامی سے واسطہ پڑے دعا کیجئے۔ کہ آیندہ اشاعت میں ہم آپ کو جمہوریت کی فتح کا مژدہ سنائیں۔

معذرت ۔ ماہ مئی کا پرچہ شائع نہ ہو سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ارم کے پرانے خریداروں سے (سے ۳) تین روپے چندہ لیا گیا تھا، جبکہ پرچے کا سائز اور حجم چھوٹا تھا۔ اب چونکہ حجم اور سائز میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (یعنی سائز ۱/۸ کراؤن اور صفحات ۶۴) یہ تو ظاہر ہے کہ اس شدید گرانی میں اتنا ضخیم پرچہ دینا مشکل ہے۔ لہذا مجبوراً ہمیں چندے میں ایک روپیہ کا اضافہ کرنا پڑا۔

ارم کے پرانے سرپرستوں سے مزید ایک روپیہ کا مطالبہ کرنا ہمیں اچھا معلوم نہ ہوا۔ بلکہ یہ بہتر خیال کیا گیا کہ گذشتہ ماہ کے پرچے کو سالنامے میں ہی ضم کر دیا جائے، اس سے گذشتہ مہینے کی کمی بھی پوری ہو گئی اور ایک روپے کے خسارے کی تکمیل بھی ——

تاہم ۔ ہم اس شدید انتظار کی تکلیف کے لئے معذرت خواہ ہیں جو ایک خریدار کو پرچے کے بروقت نہ آنے سے ہوتی ہے۔

ادارہ

آرٹ کی تعلیم

ایک شام میں جوش ملیح آبادی سے ملنے پہونچا۔ شاعر اپنے بیٹے کے ساتھ . . . باتیں کر رہا تھا ۔ علیک سلیک کے بعد میں بیٹھ گیا۔ لڑکے نے یکایک کہا۔ "وہ دیکھو ابا وہ آسمان پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی میں رنگین اوڑھنی پھیلا دی گئی ہے۔" شفق کی رنگا رنگی کو دیکھ کر شاعر کے کمسن بیٹے کا یہ جملہ حسن کاری کا پہلا درس ہے۔ فطرت کے حسن کو انسان اپنے آفریدہ حسن کے مقابل بنا کر یا فطرت کے حسن کو اپنے حسن کے تخیل سے بدلا دیکر آرٹ پیدا کرتا ہے۔ جس کا پہلا سبق مشاہدہ ہے۔

آرٹ کی تعلیم کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہم جائزہ لیں کہ اس وقت ہمارے ملک میں اس فن کی تعلیم کس انداز سے ہو رہی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ نظری طور پر یہ بتایا جائے کہ اس فن کو کس طرح آنے والی نسلوں تک اچھے سے اچھے طریقے سے پہنچایا جائے۔

اس وقت تک ملک میں تعلیم کے ساتھ ڈرائینگ بھی ابتدائی اور ثانوی مدارس کے درس میں ہے۔ اور طلباء کو بالکل ابتدائی طریقہ پر اس غرض سے تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ اپنے جغرافیہ کے نقشے اچھے بنا سکیں یا علم ہندسہ کی اشکال بنانے میں مدد ملے۔ ہر مدرسہ میں غیر رسمی طور پر یہ روایت بھی چلی آتی ہے کہ بعض شوقین طلباء کو ابتدائی فری ہینڈ۔ ماڈلنگ۔ ڈزائن۔ جامیٹری اور رنگ کاری کی مشق کرا کے بمبئی یا مدراس کے امتحانات کامیاب کروائیں۔ اس سے اب تک صرف یہ ہوتا تھا کہ طلباء میں سے بعض مضامین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس قدر ترقی کر لیتے کہ ان میں اور ان کے ڈرائینگ ماسٹر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس سے کچھ آگے بڑھیں تو بعض طلباء بمبئی یا مدراس جا کر ڈپلوما حاصل کرتے ہیں اور چند ایسی بھی مثالیں ہیں جنہوں نے یورپ جا کر موقلم کی جنبش میں مہارت حاصل کی ہے۔

ہمارے مدارس میں ڈرائینگ سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہفتہ میں چند گھنٹے ہر جماعت کے طالب علم کو اس فن کی تحصیل کے لئے ملتے ہیں۔ وقت ہوا۔ ماسٹر صاحب کلاس میں تشریف لائے۔ اور بورڈ پر کوئی پھول پتہ یا چڑیا چاک سے بنا دی یا بنا بنایا نمونہ بورڈ سے آویزاں کر دیا۔ اور لڑکوں کو اپنی کاپی پر نقل کرنے کا حکم دیا۔ گھنٹہ ختم ہوا۔ طلباء دوسرے مشاغل میں مصروف ہو گئے جو چند طالب علم خاص امتحانات کے لئے منتخب ہوئے ان کی تعلیم بھی اسی انداز سے ہوتی ہے کہ استاد نے رنگ کاری ماڈلنگ وغیرہ کے چند عملی گر انہیں بتا دئے

اور بس ۔

حکومت نے اس فن کی ضرورت کی طرف توجہ کی اور گذشتہ سال سے ایک کالج "مدرسہ فنون لطیفہ و دست کاری" کے عنوان سے قائم کیا جس کے صدر خان بہادر سید احمد صاحب اجنتہ کے مشہور حسن کار ہیں ۔ یہاں پر اس فن کے ہر شعبہ کو قائم کیا گیا ہے۔ اور حسن کاری کے ساتھ فن کاری کی تعلیم پر بھی زور دیکر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حیدرآباد میں صحیح معنوں میں حسن کار پیدا ہوں۔ لیکن وہ بے روزگاری کی مصیبت سے بچتے رہیں۔ یہ ادارہ تو ابھی شروع ہی کیا گیا ہے۔ اب تک جو حال ایک زمانہ سے آرٹ کی تعلیم کا رہا ہے۔ اس کا بہترین مظاہرہ تعلیمی نمائشوں میں ہوتا رہا ہے۔ وہاں کی نمائش دیکھنے کے بعد ہر ناظر پر دو چیزیں منکشف ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ جتنے نمونے نمائش میں آتے ہیں ان میں سے ۹۹ فیصدی دوسرے حسن کاروں کی بھونڈی نقلیں ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے نوجوان طلباء کو باوجود مواقع حاصل نہ ہونے کے اس فن سے فطری لگاؤ ہے۔ ہمارے دوسرے نتیجہ کے متعلق آپ کو تشویش ہوگی کہ یہ پہلے سے متضاد ہے۔ لیکن اگر آپ مدرسوں میں آرٹ کی تعلیم کے انتظامات سے واقف ہوں تو یہ حیرت باقی نہیں رہے گی ۔

[illegible] حسن کارانہ اعمال ہیں اس لحاظ سے ہمارا ملک ایک شاندار فنی روایت رکھتا ہے۔ [illegible] اجنتہ کے رنگ کار الورہ کے آذر اور گولکنڈہ کے تعمیر کار سب صف اول میں نظر آتے ہیں۔ جس ملک میں ماضی کے خزانے ایسے لافانی شہکاروں سے معمور ہوں اس ملک کے بسنے والوں میں فطری صلاحیتوں اور نسلی ودیعتوں پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہیں سے ہماری تصویر کا دوسرا رخ شروع ہوتا ہے ۔

حسن کاری کی تعلیم کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے اس کے جواب کے لئے ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ایک حسن کار کن چیزوں کا مرکب ہے۔ قوت مشاہدہ تخیل کی بلند پروازی صبر آزما محنت کی برداشت اور فن سے والہانہ وابستگی یہ وہ ضروری اجزا ہیں جن کے بغیر ایک حسن کار مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب ایک ایک چیز پر غور کیجئے۔ تو ہمارے سوال کا حل خود ہی مل جائے گا۔ ہمارا وطن فطرت کے حسن کا گہوارہ ہے۔ دکن کی صبح و شام یہاں کے فطری مناظر رنگوں کے طوفان اور نظاروں کا ہجوم موسموں کی متانت اور زمین و آسمان پر اس کا اثر ہر چیز ایک فطرت پرست کے لئے دعوت عمل ہے۔ اور یہی چیزیں مل کر شاعر اور حسن کار کے لئے جنت نگاہ و فردوس گوش بن جاتی ہیں۔ یہیں پر پہلا درس آرٹ کا دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اس پہلے درس سے مانوس ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے نئے پل پر شام کا نظارہ دیکھا ہو اور لطف اٹھایا ہو۔ حسین ساگر کی صبح دکن کے پہاڑوں کا بارعب منظر قلعہ گولکنڈہ کی پرشکوہ ویرانی شہر حیدرآباد کا

طائر نگاہ نظارہ میناروں گنبدوں کی مشرقی بستی نیلے آسمان پر سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے شفق کی سرخ پیشانی پر ابر کی رنگین تحریروں تاریک رات اور ستاروں کا چمنستان دکن کی بدمست چاندنی راتیں غرض ـ ـ ـ

شور آبادی میں سناٹا سا ویرانوں میں ہے
کتنی شیرینی تری قدرت کے افسانوں میں ہے

اگر ایک معلم حسن کاری فطرت کے اس خمخانہ سے مدہوش ہو کر نکلے اور اپنے متعلمین کو اس کا جرعہ کش بنا سکے تو یہ پہلا درس حسن کار کے لئے کتنا دعوت نظر بن سکتا ہے۔ رنگوں کو ان کے مناظر سے مطالعہ کرنا اشیاء حسین کی ترکیبوں کو تلاش کر کے ان کا مجسمہ کرنا انسانی اعمال اور قدرت کے مناظر کے اتصال میں حسن تلاش کرنا اور مشاہدہ کی اس منزل سے گذر کر حسن آفرین بن جانا حسن کاری کی تعلیم کا پہلا سبق ہے۔

دوسری سعی ایک معلم کے لئے نوخیز متعلم کو دماغی غلامی سے آزاد کرنا ہے ظاہر ہے کہ جب حسن کاری کی نمائش میں نقل کو اصل پر غالب دیکھیں تو اس خصوص میں مایوسی ہوگی۔ کیا واقعی ہمارے متعلم ایسے بے تخیل ہیں کہ وہ باوجود فطرت کی دولتوں کے مالک اور آبا و اجداد کی بیش بہا روایتوں کے ورثہ ہونے کے دوسرے دیس اعمال کی طرح ہمارے حسن کار کا تخیل بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ مرعوبیت؟ غدر کے بعد سے جنگ عظیم تک ہندوستان پر طاری رہا۔ اس کا اثر ہمارے حسن کار کے اعصاب پر بھی ہوا۔ یہ بیزاری بری اور ہر چیز غیر کی بھلی ـ یہ ہماری ذہنیت کا عکس رہا ہے۔ چنانچہ اسی دور میں روی ورما نے مغربی ڈھنگ پر ہندوستانی دیومالا اور مذہبی قصص پیش کرنا شروع کئے مرعوب ذہنیت کے ہندوستانی نے اس کے قدردان ہوئے۔ اس دور کے بعد ہندی قومی احساس کو ٹھیس لگی۔ بمبئی نے اجنتہ کی نقل شروع کی اور بنگال نے ان نمونوں سے درس لیا۔ اب ہر طرف "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو"
کا نعرہ لگا۔ جذبہ حب الوطنی نے شدت پکڑی ہندوستان کو ماضی پرست بنا دیا۔ پہلے مذہب تخیل کا آقا تھا۔ تو اب حال پر ماضی حکمران ہے۔ اس ماحول کی پیداوار اگر نقلوں ہی کو کارنامہ سمجھنے لگے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہمارا ملک جو ہندوستان کی عام فضا سے نصف صدی پیچھے رہتا ہے اس نے آج محسوس کیا کہ اس کے پاس ایک آرٹ کالج کی کمی ہے۔ ایسی حالت میں اس کی تعلیمی ماتحت حسن کاری میں ہمیں نقلیں ملیں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔

جب کبھی میں غور کرتا ہوں کہ آخر وہ کونسی رکاوٹ ہے جو ہمارے نوخیز حسن کار کو اپنے جوہر سے ناآشنا رکھتی ہے۔ اور غیر کی اسیری نظر آتی ہے۔ وہ کبھی آزاد طریقے پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ گرد و پیش سے بے خبر اپنے ماضی کے حسین نقوش سے ناآشنا اپنی اندرونی صلاحیتوں سے بے بہرہ اس کی وہی کیفیت

ہوتی ہے جو ہمارے ایک عام طالب علم کی ہے۔ کہ اس سے اگر دریافت کیا جائے کہ "بوسٹن" کہاں ہے تو تفصیلات کے ساتھ بیان کردے لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ میرٹھ کہاں ہے تو سمت تک بھی نہ بتا سکے۔

اس افسوس ناک حالت سے نکال کر ہمارے حسن کار کو اس کے اصلی میدان میں لانا معلم حسن کار کا فرض ہے۔ وہ اس کو بتا سکتا ہے کہ ہندوستانی فطرت اور اس کا تقاضائے حسن کاری کیا ہے۔ اس کے تخیل کے سانچے اس کے روشن اور رنگین ماحول میں کیا ہو سکتے ہیں وہ کس طرح اپنی فطرت میں ڈوب سکتا ہے۔ وہ ماضی سے کیا حاصل کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماضی میں کیا اضافہ کر سکتا ہے۔ بمبی نے ماضی کی نقل کی بنگال نے ماضی کی تقلید کی ٹیگور کی بانسری کرشن کے لئے بجنے لگی۔ چغتائی نے ترک و ایران اور بت خانۂ چین کی روایت کو زندہ کردیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہمیں یہ یقین نہیں آیا۔ کہ نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول۔ ایک حقیقت ہی ہم اجنٹہ کے وارث ہیں لیکن محض اپنی وراثت کو مٹانا ہمارا کام نہیں بلکہ اس میں اضافہ کرنا ہمارا فریضہ ہے" "زندہ بدست مردہ" کی ذہنیت سے نکل کر مستقبل کی تعمیر ہمارا حق ہے۔ معلم حسن کاری اگر خود اتنا وسیع قلب اور آزاد دماغ رکھتا ہے تو وہ نوخیز حسن کاروں کو ان تمام چیزوں کا درس دے سکتا ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ تھا جو اجنٹہ اور تاج کی تخلیق کر سکے۔ اور وہ سب کچھ ہے جس سے نئے شہکاروں کے ذریعہ پرانی روایتوں کو اجاگر کیا جا سکے۔ ایک حسن کار رامائن کی داستان زندہ کر سکتا ہے۔ مہا بھارت کی خون کی ہولی کو سامان عبرت بنا سکتا ہے راجپوتوں کا تہور ترکوں کا بانکپن مغلوں کا شکوہ۔۔۔ غرض ماضی کی رنگینیوں کو مستقبل کی نو بدین بنا سکتا ہے۔ ایک حسن کار چاہے تو اپنے رنگوں سے نوے گیت نئے نغمے اور نئے نظارے پیدا کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو اہل ہند کو بتا سکتا ہے کہ اس کی روح آزاد ہے خیال آزاد ہے۔

اب رہا یہ کہ حسن کار میں سعی پیہم اور والہانہ انہماک پیدا کریں اس کے لئے کوئی تردد کی ضرورت نہیں جب نظریں حسن بین بن جائیں اور دل حسن کی جنت تو تخیل کی شمع کے لئے پروانوں کی کمی نہیں۔ دنیا میں سچا ذوق ہی سچا شوق پیدا کرتا ہے۔ ہمارا حسن کار نگاہ دماغ اور تخیل کی تربیت کے ساتھ خود بخود مہارت کی طرف بھی رجوع ہوگا۔ کسی فن کی مہارت بجائے خود کوئی چیز نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ ایسا ذریعہ جس سے ایک حسن کار اپنی خودی کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس تخلیقی قوت کو مرتسم کرتا ہے۔ جس کو حسن حقیقی نے حسن مجازی میں ودیعت کیا ہے۔

اس گفتگو میں میں نے شاید بعض باتیں ایسی کہی ہیں جو تلخ ہوں لیکن کیا کیا جائے۔

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

جس روز ہمارے حسن کار کو اپنی فطرت کا راز معلوم ہوگا وہ ملک کے لئے سب سے سعید دن ہوگا۔ شاید اقبال نے یہ شعر حسن کار ہی کے لئے کہا ہے ؎ چہ باید مرد را طبع بلند مشرب نابے ؛ دل گرم و نگاہ پاک بین و جان بیتابے

سید محمد اکبر صاحب وفا قانی

برنارڈ شا

از ظفر جاوید علیگ سابق اڈیٹر دی کامریڈ ڈیلی بمبئی

اس مختصر سے مضمون میں نہ تو برنارڈ شا کی زندگی کے تفصیلی حالات پیش کرنے کی گنجائش ہے اور نہ اس کے علمی وادبی کارناموں پر تنقید وتبصرہ کی۔ برنارڈ شا بحیثیت ایک مصنف ومفکر کے چند خصوصیات کا حامل ہے۔ ذیل میں اس کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ ظ۔ ج

برنارڈ شا کی عمر ۸۵ سال سے متجاوز ہو چکی ہے اور اس وقت وہ انگلستان کا سب سے زیادہ دولتمند مصنف مانا جاتا ہے۔ سقراط کی طرح اس کے لئے بھی زہر کا پیالہ بھرا جا چکا ہے۔ مگر سقراط کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اس کو پئے اور برنارڈ شا متوقع ہے کہ زہر کا پیالہ بطور نذرانہ کے اس کو پیش کیا جائے گا۔

برنارڈ شا کی تحریروں میں جدت، ندرت اور ذہانت کے علاوہ طنز کے نمایاں پہلو عام طور پر خصوصیت کے ساتھ نمایاں رہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو عام ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ شا کو ایک مقرر کی حیثیت سے بھی کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی تقریروں میں اس کے چبھتے ہوئے جملے تبسم آمیز تلخیاں اور میٹھے میٹھے طنزیہ فقرے اس کے سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

برنارڈ شا رسمی خاکساری اور ظاہری ہمچدانی کا قائل نہیں ہے اور نہ وہ اس پر کبھی عمل کرتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ اس نے کئی بار علی الاعلان خود کو شیکسپیئر سے بہت زیادہ بڑھا چڑھا ثابت کیا ہے۔ اکثر و بیشتر لوگوں میں تقاریر کرتے وقت اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل چکے ہیں "انگلستان کے سب سے عقلمند آدمی کی تلاش میں آپ کو بہت دور نہیں جانا پڑے گا۔ دیکھئے۔ وہ آپ کے سامنے ہے اور آپ سے مخاطب ہے، میں انگلستان بھر میں سب سے زیادہ فراست کا مالک ہوں"۔ یہ الفاظ برنارڈ شا کچھ اس معصومیت اور یقین آمیز سادگی سے کہتا ہے کہ اس کے معترضین خود کو بے بس سا پاتے لگتے ہیں اور حاضرین حیران ہو کر ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی کو اس کی تردید کی جرأت نہیں ہوتی۔

اس کی ابتدائی زندگی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لندن کے ایک تھیٹر کی اسٹیج پر اس کا ایک ڈرامہ پیش کیا گیا ڈرامہ کے اختتام پر عوام کے اصرار سے اس کو بحیثیت ڈرامہ کے مصنف کے اسٹیج پر آنا پڑا۔ ہال میں سناٹا تھا اس کو دیکھتے ہی ہزاروں آدمیوں نے تالیاں بجائیں مگر ایک شخص نے شرارتاً "ہشت۔ تھو" کہا۔ برنارڈ شا نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "دوست میں بھی تمہارا ہمخیال اور ہمزبان ہوں مگر ہم دونوں

ان ہزاروں کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں "
برنارڈ شا کی زندگی میں ہزاروں ایسے واقعات پیش آئے ہیں جبکہ اس نے اپنے معترضین کو بڑے بڑے منہ توڑ جواب دے کران کو شرمندہ کیا ہے۔
ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ لندن کے مشاہیر نے دنیا کے مشہور ترین سائنس داں آئنسٹائن کے اعزاز میں ایک شاندار ڈنر ترتیب دیا اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے برنارڈ شا کہتا ہے " دنیا میں صرف دو ہی آدمی تو غیر فانی شہرت و قابلیت کے مالک ہیں۔ ایک میں اور دوسرا ہمارا معزز مہمان "
ایسڈورا ڈنکن جو ایک مشہور رقاصہ تھی اور رقصیاتی سائنس کی ایک زبردست ماہر ایک مرتبہ برنارڈ شا سے کہنے لگی کہ اگر اس کی اور برنارڈ شا کی شادی ہو جائے تو ایک ایسی اولاد پیدا ہوگی جو اپنے حسن اور ذہانت میں یکتائے روزگار مانی جائے گی۔ برنارڈ شا نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا " ہاں ٹھیک تو ہے لیکن اگر اتفاق سے اس اولاد کو میرا حسن اور تمہاری ذہانت ملے تو کتنی زبردست ٹریجڈی ہوگی " وہ بیچاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور ایسا جھینپی کہ پھر کبھی اس سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔
کرنل لارنس اور برنارڈ شا کی بہت دوستی تھی یہ وہی لارنس ہیں جو کبھی عرب بن جاتے تھے کبھی ترک اور کبھی افغانی۔ اپنی عمر کے آخری دور میں اپنی اصلی شخصیت کو چھپانے کی خاطر اس نے "پرائیوٹ شا" کا نام اختیار کر لیا تھا۔ برنارڈ شا نے اپنی دوستی اور محبت کی یادگار کے طور پر اپنی ایک کتاب اس کے نام سے معنون کی اور لکھا۔ " پرائیویٹ شا کی خدمت میں "پبلک شا کی طرف سے" برنارڈ شا اپنی شہرت پر بہت زیادہ نازاں اور مسرور ہوتا ہے۔
برنارڈ شا گوشت بالکل نہیں کھاتا ہے بلکہ صرف نباتاتی اغذیہ ہی اس کو مرغوب ہیں۔ گاندھی جی جب گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے تھے تو برنارڈ شا نے بجائے سیاست کے نباتاتی اغذیہ پر بہت طویل اور پرجوش گفتگو کی تھی۔
برنارڈ شا کی زندگی اس قسم کے دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے جو عام لوگ نہیں جانتے ہیں لیکن دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان واقعات سے اس عظیم الشان ہستی کی فطرت اور طبیعت پر بہت کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔ ایک مرتبہ دوران سفر میں جہاز کے کپتان نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ " یہ تو کہیئے کہ آج کل دنیا میں سب سے بڑا ڈرامہ نگار کون ہے ؟" برنارڈ شا نے حیرانی سے جہاز کے کپتان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ " ارے۔ ارے یہ بھی آپ کو نہیں معلوم! شاید آپ میرے نام سے واقف نہیں ہیں "
برنارڈ شا ظاہرہ مروت کا قائل نہیں ہے وہ انتہا سے زیادہ منہ پھٹ اور صاف گو واقع ہوا ہے۔

ایک دفعہ ایک امریکن نے اس کو ایک خط لکھا کہ وہ صحیح الدماغ لوگوں کے لئے ایک کلب قایم کرنا چاہتے ہیں اور یہ درخواست کی کہ برنارڈشا اپنا ایک پیام روانہ کریں۔ برنارڈشا نے جواب دیا کہ "اگر امریکہ میں کوئی ایسا کلب قایم کیا گیا تو وہ ہمیشہ خالی رہے گا"

اس کے ایک مشہور ڈرامہ "پگمیلین" کو ممالک متحدہ امریکہ کے موشن پکچرز آرٹ اکاڈمی نے قابل انعام تصور کیا اور سال رواں کی بہترین کہانی ہونے پر انعام دیا۔ برنارڈشا یہ خبر سُن کر بہت آگ بگولہ ہوا اور کہنے لگا "یہ آخر ان لوگوں نے سمجھ کیا رکھا ہے؟ ان کے خیال میں میرے لئے یہ انعام باعث فخر ہے۔ لیکن۔ نہیں۔ ہرگز نہیں میں اس کو اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ ایسے ڈرامہ کے بارہ میں کچھ کہنا جہالت پر مبنی ہوگا جس کی شہرت کے ڈنکے گذشتہ بیس سال سے تمام دنیا میں بج رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہالی وڈ والوں نے میرا نام پہلی بار سنا ہے اور وہ مجھ کو ایک چوبیس سالہ نوجوان سمجھتے ہیں"

نظم

کیوں؟

متین سہروردی

جب سرود و رقص و نغمہ ہوگئی ہو کائنات
دل ہم آہنگی نہیں کرتا ہے کیوں ادراک سے
چاندنی چوکھٹ پہ جب جھکتی ہے تاروں کی جبیں
رُوح کیوں ہو جاتی ہے سرکش خدائے پاک سے
تیز برساتوں میں جب ہوتی ہے دل کی آگ تیز
مسکراتا ہے کوئی کیوں دیدۂ نمناک سے
رقص جب کرتی ہے فطرت آسمانی ساز پر
کھیلتا ہوں کیوں میں اپنے دامن صد پاک سے
وقت سجدہ بن کے کیوں مسجود آجاتے ہیں آپ
دیکھئے آواز دیتا ہے کوئی افلاک سے

لاکھ بہلائے دلِ شاعر بہلتا ہی نہیں
تار چھیڑے جارہے ہیں ساز بجتا ہی نہیں

دی۔ دکن فلور ملس لمیٹڈ اورنگ آباد

ملکی مصنوعات کے ترقی و تزوید سے عام طور پر جو دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ عوام اس چیز کو سن کر خوش ہونگے کہ دکن فلور ملس لمیٹڈ اورنگ آباد کی مشنری مقام پر پہونچ گئی ہے تنصیب کا کام جاری ہے تقریباً عمارت بھی سہ منزلہ تک تیار ہوگئی ہے ایک ماہ کے اندر کام کے آغاز ہونے کی توقع ہے۔ اور حکومت سرکار عالی نے بھی کافی رقم صرف کر کے حصہ لیا ہے اور با اثر بورڈ آف ڈائرکٹرس اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں چنانچہ شے شاوری صاحب۔ احمد محی الدین صاحب کے۔ بی۔ راجن صاحب۔ یوسف حاجی ولی محمد صاحب۔ شیشی مل بختیار مل صاحب اور رائے صاحب پنا لال لاہوتی صاحب' گلبرگہ ملس لمیٹڈ اس کے ڈائرکٹرس ہیں حصص کافی فروخت ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ فی حصہ سو روپیہ ہے جو چار اقساط میں وصول کیا جاتا ہے ہنوز فہرست کھلی ہے عجلت کر کے حصہ داربن جائیے پراسپکٹس اور دیگر تفصیلات مینجنگ ایجنٹ اورنگ آباد سے حاصل کیجئے

پیام

مولوی کے نام!

یہ بےحسی، یہ تغافل، یہ خامشی، یہ جمود — مری نگاہ میں ہیں تیری زندگی کے حدود
ترے لبوں پہ دعا رہ گئی حفاظت کی — عدو نے توڑ کے رکھ بھی دیا طلسمِ وجود
ترا شمار نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں — بڑے مزے کی جگہ ہے جہانِ بود و نبود
حجابِ ارض و سما سے گذر گئے اغیار — تری نظر سے نہ اُٹھا نقابِ غیب و شہود
یہ تری گرسنگی ہے کہ شکرِ نعمت اب — نظر غذائے مزعّن پہ اور زباں پہ درود
جو عقل ہے تو نظر کر خدا کے بندوں پر — فقط خدا ہی نہیں مقصدِ رکوع و سجود

زمیں سے مہرِ منوّر نکلنے والا ہے
نظامِ کہنۂ عالم بدلنے والا ہے

مسلم نوجوان کے نام!

عجب تر ہی تری منزلِ حیات کی راہ — یہاں خرام عبادت ہے اور قیام گناہ
کسی سے پوچھ یہ بےکیف زندگی ہے کہ موت — نہ لب سکون، نہ خموشی، نہ اضطراب، نہ آہ

جنون کے حسن کو ناداں نہ چشمِ عقل سے دیکھ　　کہ حسن عقل کو درکار ہے جنوں کی نگاہ

ترا دماغ نہیں زندگی سے ہم آہنگ　　اگر یہ سچ ہے تو کس طرح ہو سکے گا نباہ

نہ اعتبارِ تسلی، نہ اعتمادِ طرب　　یہ تیرے درد کی شاہد، وہ تیرے غم کی گواہ

تجھے نہ دیکھ سکی بیخودی کے عالم میں　　کہیں یہ ہوش کی دنیا بھی ہو نہ جائے تباہ

ز اضطرابِ محبت حیات پیدا کن

بہا و از سرِ نو کائنات پیدا کن

فرقہ پرست کے نام!

اگر حیات کا دعویٰ ہے لا دلیلِ حیات　　دلا سکے گا نہ تیرا سکوت غم سے نجات

عدو کا ساحلِ گنگ و جمن پہ قبضہ ہے　　ترے خیال میں ہے رودِ نیل و نہرِ فرات

اگر نہیں ہے ترے دل میں ذوقِ آزادی　　نہ مل سکے گی تجھے قیدِ بندگی سے نجات

زباں نہ کھول اگر دل وطن پرست نہیں　　بہت وسیع ہے یہ مبحثِ حیات و ممات

اجل کے بھیس میں ہیں ساحرانِ بزمِ فرنگ　　سنا نہیں بھی، اگر یاد ہے فسونِ حیات

تغیرات کہاں منزلِ محبت میں　　یہ وہ مقام ہے ناداں جہاں نہ دن ہے نہ رات

غبارِ راہ نہ ہو عینِ کارواں ہو جا

ذرا سی موج نہ بن بحرِ بیکراں ہو جا

شاہد صدیقی

ادیب اور ادب

جناب شاہد صدیقی

موجودہ عہد کی عالمگیر بے اطمینانی کے مرض کا علاج کرنے کے لئے جن دواؤں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک ادب بھی ہے بظاہر میرے اس دعوے میں کوئی روح نہیں معلوم ہوتی، لیکن جن لوگوں نے نفسیات انسانی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور جن کی نگاہیں فرد و جماعت کے باہمی تعلق، اس تعلق کی لطافت۔ اور اس کے اسباب تک پہنچے ہیں اور جو لوگ الفاظ کے ذریعہ سے خیالات کی اشاعت اور اس کے تاثرات سے واقف ہیں، ان سے جب آپ دریافت فرمائیں گے کہ جماعتوں کے بننے بگڑنے، اور قوموں کے عروج و زوال کی وجوہ کیا ہیں، تو وہ دوسری اشیا کے ساتھ ادب کا نام بھی لیں گے۔ کسی قوم یا جماعت کی نمایاں خصوصیت جو اسے دوسروں سے ممتاز رکھتی ہے، یقینی طور پر اس کی سیرت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سیرت کی تعریف اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ان حرکات و اعمال کا مجموعہ ہے جو کسی فرد یا کسی جماعت سے شعوری طور پر سرزد ہوں۔ یہ اعمال و حرکات اپنی خوبی و خرابی کے لحاظ سے درجہ پاتے ہیں۔ خوب کا اثر فوائد کا حامل ہوتا ہے اور خراب کا مضرت رساں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسانی جماعت کی سیرت کے اچھے بُرے ہونے میں ادب کا کہاں تک دخل ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ ہماری شعوری حرکات کہاں تک خارجی موثرات کے تابع ہیں۔ اور ان میں ادب کے تاثرات کو کیا درجہ حاصل ہے؟ اس کا ایک جواب تو تمثیلی رنگ میں دیا جا سکتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں اور آپ تسلیم بھی کریں گے کہ روس کے انقلاب میں بڑی حد تک وہاں کے ادیبوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ جو لوگ واقعات کے اسباب و علل کا پتہ چلانے کی محنت گوارہ کرتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ آلاتِ حرب سے سجی ہوئی فوج نے انقلاب روس میں اتنا حصہ نہیں لیا جتنا گورکی کے قلم نے، اتنی دور جانے کی ضرورت بھی نہیں، میرے ایک دوست ہیں جو اب سے چند مہینے پہلے معتدل قسم کے حکومت پرست اور بڑی حد تک بزدلانہ خیالات کے آدمی تھے میں نے انہیں حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی میری کہانی مہاتما گاندھی کی "تلاش حق" اور منشی پریم چند کے چند ایسے افسانے پڑھنے کے لئے دئے جن میں حریت و آزادی کی روح تھی، مطالعہ کے بعد میں نے ان کے خیالات کا جائزہ لیا تو ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کی اور خود ان ہی کی زبان سے یہ فقرہ سنا کہ "ان کتابوں نے میرے ذہن میں ایک ایسی روشنی پیدا کر دی جس کی غیر موجودگی مجھے گم کردہ راہ بنائے ہوئے تھی!" اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ ادب شخصیتوں اور جماعتوں کے ذہنی تغیر میں معاون ہوتا ہے لیکن آئیے آج کی فرصت میں منطقی طور پر اس سوال کا جواب تلاش کریں کہ ادب کسی قوم کے کردار کو کہاں تک متاثر کرتا ہے اور مختلف النوع انقلابات کی جنگ میں ادیب کے دماغ و قلم کا کیا درجہ ہے!

مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ادیب کی خصوصیات معلوم کرلی جائیں اور ان امتیازات کا ایک خاکہ تیار کرلیا جائے جو کسی ادیب کو عوام کے گروہ میں نمایاں رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کسی جماعت کے تمام افراد یکساں دل و دماغ، یکساں عادات واطوار اور یکساں جذبات وخیالات لیکر نہیں پیدا ہوتے، بلکہ افراد کی طبیعتوں کے درمیان ایسے جلی خطوط فاصل موجود رہتے ہیں جن کی مدد سے ان کی جداگانہ شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، مگر آپ اپنی جماعت میں ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو اشیار کے نرخوں اور لین دین کی باریکیوں سے واقف ہوتا ہے، وہ اپنی آمدنی وخرچ میں ایک توازن قائم رکھتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ مال سستے داموں خریدے اور کافی منافع کے ساتھ فروخت کرے آپ ایسے شخص کو تاجر کہتے ہیں، کبھی آپ کی ملاقات ایسے آدمی سے ہوتی ہے جو ایجادات کا ماہر ہے، ضروری اشیار میں مفید و بہترین تغیر وتبدل کرنا اس کا کام ہے یہ ایسی چیزیں ایجاد کرتا رہتا ہے جو ہماری زندگی کے عام وخاص مسائل پر سوچتے رہنا اس کا کام ہو، وہ اپنی جماعت کی ضروریات سے واقفیت رکھتا ہو، زمانے کے طوفان کا رُخ پہچانتا ہو، اور اس کے ساتھ ہی اپنے بہترین و فائدہ بخش خیالات کو اس طرح ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ دوسروں پر اثر کریں، اور ان کی ذہنیت کو اپنی گرفت میں لے لیں، ایسے شخص کو آپ کیا کہیں گے؟ میری رائے میں یہی ادیب ہے۔ اور مکمل غور وفکر کے ساتھ کامیاب پیرایہ میں اظہار خیال اس کا امتیاز ہے!

یہ تعریف جو ابھی آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے مختصر لیکن جامع ہے، یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں آپ ادیب کے خط وخال کا مختصر مگر واضح خاکہ دیکھ سکتے ہیں، اور ادیب کی شخصیت کے درخشاں نشانات آپ کے سامنے آسکتے ہیں، میں نے ابھی ابھی عرض کیا کہ ادیب زمانہ کے طوفان کا رُخ پہچانتا ہے، اس سے میرا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول، اپنی قوم اور اپنے عہد کے ان تغیرات سے "واقف" ہوتا ہے جو دوسروں کے لئے "ناقابل احساس" ہوتے ہیں، اسے ان تغیرات کی مضرت رسانی یا فائدہ بخشی کا علم ہوتا ہے، اور وہ اپنے اس علم کو ایسے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح وہ چاہتا ہے کہ اپنی جماعت کو کسی ایک محفوظ و بہتر سطح پر لے آئے۔ اس کوشش کے لئے اس کے قلم کی ہر حرکت وقف رہتی ہے۔ تا اینکہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائے، یا موت اس کے دماغ کی قوت فکر اور قلم کا جوش روانی چھین لے۔

ادیب کی یہ ذہنی وروحانی مشقت چند در چند خصوصیات رکھتی ہے، میری نگاہ میں ادیب کے ان پُر وقار مشاغل کا سب سے بڑا امتیاز وہ بے غرضی اور بے لوثی ہے جو اس کے ہر انداز فکر اور ہر جنبش قلم سے نمایاں ہوتی ہے، آپ اس ہنگامہ زار کائنات میں جس شخص کو بھی مصروف عمل دیکھیں گے۔ اس کا کوئی نہ کوئی ذاتی مقصد ضرور ہوگا۔ تاجر، صناع، معلم، موجد غرضیکہ ہر عملی انسان جو کچھ کرتا ہے اس کے نتائج کا بڑا حصہ اپنے لئے چاہتا ہے، کھلے ہوئے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ ہر مصروف کار انسان اپنی جد وجہد سے پہلے خود فائدہ اٹھاتا ہے اس کے بعد دوسروں کو مستفید ہونے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن ادیب کی یہ شان نہیں ہے وہ اپنی دماغی مشقت اور فکری کشاکش کو صرف جماعت یا قوم کے لئے جاری رکھتا ہے اور بہت کم اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے قلم سے روزی پیدا کرے۔ مجھے کئی ایسے ادیبوں کا علم ہے جو اپنی ذہانت وطباعی کو

اگر ادب کے علاوہ کسی اور مشغلے میں صرف کرتے تو یقیناً مختلف اقتصادی و معاشرتی حیثیتوں سے (نسبتاً) زیادہ فائدے میں رہتے۔
جس طرح ایک شرابی کامل طور پر عادی ہو جانے کے بعد شراب نوشی ترک نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح ادیب بھی درجۂ کمال تک پہنچکر مجبور ہو جاتا ہے کہ سوائے ادب کے اور کسی میدان میں قدم نہ مارے۔ شرابی کی مثال نے ایک اور نکتہ واضح کر دیا یعنی جس طرح نشہ باز صرف لذت سرور کے لئے شراب پیتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے فائدہ کا طلبگار نہیں ہوتا، بالکل ایسے ہی ادیب محض اس لطف و مسرت کی خاطر اس مصروفیت کو جاری رکھتا ہے جو اُسے ادب کے سوا اور کہیں میسر نہیں۔
جس طرح کسی جدید عمارت کی تعمیر سے پہلے یا کسی پُرانے مکان کی تجدید سے قبل معمار اس امر کے محتاج ہوتے ہیں کہ اُن کے سامنے کوئی مکمل و بہتر خاکہ موجود ہو جس کی روشنی میں وہ اپنا کام شروع کر سکیں اسی طرح "مصلحینِ قوم" کو بھی اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ قومی اصلاح یا تعمیر کے سلسلہ میں ان کے روبرو کوئی لائحہ عمل ہو، کوئی نقشہ ہو کچھ خطوط ہوں اور کوئی ایسی داغ بیل ہو جو انہیں آغازِ کار پر اُبھارے اور اُن کی عملی جدوجہد کو کسی نصب العین کے تحت کامیاب بنائے اس قسم کا خاکہ صرف ادیب ہی تیار کر سکتا ہے۔ وہ سماجی زندگی کے مختلف تاریک و منور گوشوں کو دیکھتا ہے۔ ہر حیثیت سے ان کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور پھر لوگوں کو بتاتا ہے کہ کس مقام پر کیا کمی ہے، جیسے کوئی کسی گھر کا نگراں ہو اور طوفانی بارش سے پہلے معماروں کو متوجہ کر دے کہ فلاں حصہ کی دیواریں کمزور ہیں اور فلاں مقام پر بنیادوں میں لرزش پیدا ہو سکتی ہے کیا کسی جہاز کا دور اندیش و ذمہ دار مسافر جو ہوا کا رُخ دیکھکر موجوں کے ارادے سے خبردار ہو جائے اور پھر ناخدا سے کہے کہ کس سمت چلنا خطرناک ہے اور کدھر مڑجانا اطمینان بخش!
جو لوگ کسی کام کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ ادیب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس کی قوم قطعی "بے عمل" ہے ان کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ تمام اُدبا محض کاغذ و قلم کی جنگ ہی کے عادی ہوتے ہیں، کاہلوں کی طرح غور و فکر کرنا اور پھر اس غور و فکر کے نتیجہ کو کسی حیثیت میں عوام تک پہونچا دینا ادیبوں کی ذمہ داری ختم کر دیتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے جس میں قلم کی جنگ بیکار ثابت ہو اور شمشیر آزمائی لازمی نظر آئے تو ادبا کی شخصیتیں قطعی بے مصرف ہو جاتی ہیں اور "گوشۂ عافیت" میں بیٹھکر قلمی جہاد کرنے والے میدان جنگ کی ہولناکیوں کے حریف نہیں بن سکتے۔ بادی النظر میں یہ اعتراضات باوزن معلوم ہوتے ہیں، لیکن گہری نگاہ سے دیکھنے کے بعد حقیقت کھلتی ہے اول تو تواریخی شواہد اس امر کی تردید کے لئے موجود ہیں کہ ادیب محض اہل قلم ہوتا ہے اور اس کے لئے صاحب سیف ہونا ممکن نہیں۔ دوسرے اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہی اعتراض مہمل سا نظر آتا ہے، جماعتی جدوجہد اور قومی تحریکات میں تقسیم کار کا اصول بڑی اہمیت رکھتا ہے اور تقسیم کار افراد متعلقہ کی اہلیت پر منحصر ہوتی ہے فرض کیجئے کہ آپ ایک مکان تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔ اب آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ فن تعمیر کے مختلف شعبوں میں دستگاہ رکھنے والے اشخاص کی مدد حاصل کریں۔ نقشہ نویس، ڈیزائن تیار کرنے والے معمار، نجار، لوہار یہاں تک کہ محض اینٹ، پتھر اور مٹی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنیوالے لوگ بھی آپ کے لئے ضروری ہیں، اور سب اپنی اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک درجہ رکھتے ہیں، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ عمارت صرف نجار یا لوہار نے تیار کی اور نقشہ نویس کا اس میں کوئی حصّہ نہیں انتہائی غلط بیانی ہے۔ اسی طرح

قومی و ملکی تعمیر و اصلاح میں ادیب کا بھی ایک درجہ ہے اور جہاں تک اس کی فایدہ بخشی کا تعلق ہے وہ کسی دوسرے مصلح سے ہرگز کم نہیں، ایک اور مثال ہے جس کے ذریعہ سے ادیب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگر کسی قافلہ کے افراد منزل پر پہنچکر اپنی تگ و دو کی تعریف کریں اور اس زحمت کو فراموش کردیں جو اُن کے رہنما نے برداشت کی تو اُسے احسان ناشناسی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ راستہ کے مصایب سے دونوں یکساں دوچار ہوئے رہرو بھی اور رہنما بھی۔ لیکن آخرالذکر کو یہ خصوصیت بلا شرکت غیرے حاصل ہے کہ اس نے صحیح راستے دریافت کئے اور اپنے پیروؤں کو منزل تک پہنچایا۔

پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ قومی سیرت کی تعمیر کے سلسلہ میں ادیب بھی حصہ گیر ہوتا ہے اس کے دماغ و قلم کی پیداوار براہ راست جماعت انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ عرض کردینا بھی ضروری ہے کہ کسی ملک یا قوم کے تعمیری تغیرات میں جن مؤثرات کو دخل ہوتا ہے ان میں خارجی بہت کم اور داخلی زیادہ ہوتے ہیں۔ ظاہری حالات کا بہتر ہونا اس امر کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ باطنی کیفیات میں خوشگوار تغیر ہوگیا ہے اور مظاہر کی ابتری یہ باور کرانے کے لئے کہ قابل اطمینان نہیں۔ موسیو لیبان ایک نفسیاتی ہے جس نے اپنی عمر کا بڑا حصہ نفسیات اجتماع کے مطالعہ میں صرف کیا ہے وہ ایک موقعہ پر کہتا ہے کہ "ہر قوم چند نفسیاتی خواص رکھتی ہے جو قابل تغیر اور انقلاب پذیر ہوتے ہیں۔ دراصل یہی نفساتی خواص ہیں جن کے تغیر و تبدل سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں"

میں اس قول میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی قوم کے نفسانی خواص میں اصلاحی انقلاب پیدا کرنا، اضمحلال کو قوت سے، پستی کو بلندی سے اور افسردگی کو زندہ دلی سے بدل دینا صرف ادیب کا کام ہے، اس طرح قومی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں ادیب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ سوال ابھی باقی ہے کہ ہماری زبان کے ادبا کا موجودہ طریقہ کار کیسا ہے ؟

از جناب ثریا پروین صاحبہ۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

ریجی انگلٹن بہت کمزور سا تھا۔ اس کا رنگ چنبیلی کے پھول کی طرح سفید وہ فوج کے ہرگز قابل نہ تھا۔ مگر کوئی اُسے دیکھتا تو یہی کہتا یہ حضرت تو شہر کی سوسائٹی کے لائق ہیں۔ ہمیشہ بنے ٹھنے رہتے ہیں۔ البتہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ گو یا یہ حضرت چنبیلی کی کلی کی طرح سفید اور کمزور تھے تو کیا لیکن مزاج بھی ان کا بالکل چنبیلی کے پھول کی طرح سرد تھا۔ سخت سے سخت لڑائی میں بھی جہاں مجبوراً بچاؤ کے لیے سب چیزیں پھینک دینی پڑتی تھیں یہ حضرت اپنا ریڈیو سٹ اور سگار کیس بغل میں دابے رہتے کام ختم ہونے کے بعد دنیا و مافیہا سے بے خبر سگار ہونٹوں میں لگائے ریڈیو پر موسیقی سنا کرتے۔

ایک صبح ۶۶۶ فیلڈ رجمنٹ ا۔ آے۔ کا۔ ک۔ توپ خانہ انگریزی پیدل فوج کی مدد پر مامور تھا۔ ان کی ۲۵ پونڈی توپیں ایک پہاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں اور اسی پہاڑی کے مغربی حصے پر ایک دیکھ بھال کی چوکی مقرر کی گئی تھی۔ جہاں سے توپوں کو گولہ باری کا حکم ملتا تھا۔ جیسے جیسے دوپہر ہونے لگی انگریزی پیدل فوج آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ دیکھ بھال کے افسر کو دوربین سے بھی کچھ نہ دکھلائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے میجر کو ٹیلیفون کر کے پوچھا اگر اجازت ہو تو میں اور آگے بڑھ جاؤں۔ لیکن میجر نے جواب دیا۔ نہیں تمہارے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک اور دیکھ بھال کے افسر کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔

ابھی میجر ٹیلیفون سے گفتگو ختم بھی نہیں کرنے پائے تھے کہ ریجی انگلٹن ڈیرے میں داخل ہوا۔ یہ حضرت دوسرے افسروں کی طرح گندے کپڑوں میں ملبوس نہیں تھے بلکہ بالکل ٹپ ٹاپ صاف برجس۔ چمکدار بوٹ۔ اور استری کیا ہوا کوٹ پہنے ہوئے تھے میجر نے کہا لو ریجی یہ تھوڑا سا کام تمہارے لئے ہے۔ دیکھ بھال کے افسر نے اطلاع دی ہے کہ ایک اور دیکھ بھال کا افسر بھیجا جائے کیونکہ اس کے مقام سے لڑائی نظر نہیں آتی۔ لہٰذا جلدی سے چل دو اور سکنڈ بٹالین نارتھ رائڈنگ سے تعلق پیدا کرو۔

ریجی نے پوچھا۔ یہ رجمنٹ ہوگی کہاں۔ میجر نے نقشہ پر لڑائی کا موقعہ دکھلا کر کہا بس یہی کہیں ہوگی۔ اور جب تم ہیڈ کوارٹر سے مراسلت پیدا کر لو تو وائرلس کے ذریعہ مجھے اطلاع دیجو جو کچھ ان کا کرنل کہے اس پر عمل کرنا۔ ہیڈ کوارٹر کا پتہ لگانے کے لئے تمہیں تھوڑی سی تلاش کرنا پڑے گی۔ کیونکہ وہ بہت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے اور اگر تم اپنے ساتھ ٹاک کو لے جاؤ تو زیادہ محفوظ رہو گے۔

ٹاک اس رجمنٹ کی آہن پوش موٹر تھی۔ اور عام طور پر دیکھ بھال کے افسر اس کو استعمال کیا کرتے تھے۔"..... شکریہ

میجر صاحب" ریگی نے آہستہ سے کہا" مجھے اس پہ اعتبار نہیں مجھے تو اپنی موٹر ہی پسند ہے۔ گو وہ گولیوں کو تو نہیں روک سکتی مگر وہ خود کبھی نہیں رکتی"۔

اس طرح ریگی انگلین چمکتے ہوئے بوٹ پہنے اپنے ڈرائیور کے بازو جا بیٹھے وائرلس اسپرٹیر کو پیچھے بٹھالیا۔ اور نارتھ ۔ رائڈنگ رجمنٹ کے ہیڈکوارٹر کی تلاش میں نکلے ۔

ایک حملہ آور انفنٹری کے ہیڈکوارٹر کا پتہ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ کیونکہ آجکل جنگ بہت تیزی سے بڑھتی یا پیچھے ہٹتی ہے۔ لہٰذا ابھی تو ہیڈکوارٹر یہاں ہوتا ہو تھوڑی دیر میں وہاں اور پھر وہاں سے وہاں اور پھر وہاں سے کہیں اور۔ اس طرح میں بھی گھنٹوں خرچ کئے جا سکتے ہیں ۔

ریگی ایک سڑک پر پڑ گیا۔ یہاں اُسے کچھ کچھ جنگ کے نشان دکھائی دینے لگے چند ہی چھوٹے چھوٹے گروہوں بیٹھے تھ کچھ مُردہ۔ کچھ زخمی۔ سپاہی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے تھے۔ موٹریں اور موٹر سائیکلیں تیزی سے ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں ریگی کی اپنی مصیبتوں کا بھی اب آغاز ہو چکا تھا۔ ریگی نے ایک زخمی سارجنٹ سے ہیڈکوارٹر کا پتہ پوچھا۔ آپ مجھ سے ہیڈکوارٹر کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ ہیڈکوارٹر جیسی کوئی خاص جگہ تو ہے نہیں البتہ کرنل لڑائی کے پیچھے پیچھے اپنی موٹر میں ہیں اور وہی ہیڈکوارٹر ہے۔ اور اگر آپ نے کرنل کی موٹر کا پتہ بھی لگا لیا تو کرنل صاحب کا وہاں پتہ نہ ہوگا کیونکہ وہ لڑائی دیکھنے پیدل ہی چل نکلے ہوں گے

ریگی کو اتنی ہی اطلاع پر اکتفا کرنا پڑا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک وہ اِدھر اُدھر کرنل کی موٹر کی تلاش میں دوڑتا رہا بڑی دیر تک چلنے کے بعد آخری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑائی کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ مشین گن۔ رائفل اور دبابہ مار توپوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اپنے وائرلس اسپرٹیر سے کہا فدا مجھے ایرفون تو دینا۔ ریگی نے ان کو اپنی ٹین کی ٹوپی کے نیچے جما کر میجر سے مراسلت قائم کی۔ میں ابھی تک ہیڈکوارٹر کی تلاش میں ہوں۔ کہیں کرنل کا نام عنقا تو نہیں ہے کیونکہ (عمر بار) میں ابھی تک ان کی تلاش میں ہوں مگر نا امید نہیں ہوا۔ جیسے جیسے موٹر آگے بڑھتی جا رہی تھی ریگی اپنے میجر کو واقعات سنا سنا کر ہنستا رہا۔ مائکرفون سے میجر کو توپوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ بھی اپنی جگہ سے خود دیکھ رہا تھا کہ ریگی مشکلات میں پھنسا ہوا ہے۔ لیکن اس پر بھی ریگی کی آواز اس قدر صاف اور گھبراہٹ سے پاک تھی گویا بی۔ بی سی سے کوئی اناؤنسر آنکھوں دیکھی کمنٹری دے رہا ہے۔ میجر نے کہا "میرا خیال ہے تم ٹاک لیجاتے تو زیادہ محفوظ رہتے"۔ جی شکریہ میں بہت اچھا ہوں۔ کمی صرف کرنل صاحب کی ہے۔ ریگی نے ہنستے ہوئے جواب دیا"

آخرکار دو پہر ڈھلنے کے بعد ریگی نے کرنل کی ٹرک کو ڈھونڈھ نکالا۔ یہ ایک تپلی سی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ لیکن زخمی سارجنٹ کے قول کے مطابق کرنل صاحب غائب تھے وہ حملہ کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے کھیتوں میں سے پیدل ہی ایک پہاڑی پر گئے ہوئے تھے۔ ریگی ان کے پیچھے وہیں پہنچا۔ نارتھ رائڈنگ رجمنٹ کے کرنل اور وڈجوئنٹ دونوں ایک جھاڑی کے پیچھے حملہ کا تماشا دیکھ رہے تھے ۔

ریگی نے وہاں پہنچ کر ایڑیاں جوڑ کر سلام کرتے ہوئے کہا صاحب میں ک توپ خانے کا دیکھ بھال کا افسر ہوں۔ کیا کسی طرح میں آپ کی خدمت کر سکتا ہوں تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی صاحبزادے ہاں تم میرے کام آ سکتے ہو۔ وہ جنگل وہاں دور نظر آ رہا ہے۔ وہاں سے مشین گنیں ہمارا مقابلہ کر رہی ہیں۔ تقریباً ایک میل پرے اس نے چند مکانوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی اچھا نشانہ ہے۔ وہاں انھوں نے دبابہ مار توپیں چڑھا رکھی ہیں اور میری برین گن توپوں کی موٹروں کو ستا رہی ہیں۔" کرنل نے تھوڑی دیر تک نقشہ دیکھا۔" ان کے بعد ذرا ان نشانوں کی بھی خبر لے ڈالو اس نے نقشے پر چند مقامات دکھلاتے ہوئے کہا۔ یہ مقام دشمن کے جمع ہونے کے لئے بہت اچھے ہیں۔ اور پھر کچھ سوچ کر کہا۔ اگر اب تمہاری تدبیریں کام نہ دے سکیں تو اس جنگل پر دھوئیں کی چادر لگا دینا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کتنی دیر لگے گی۔" ریگی نے ایک رومال نکال کر ہوا کا رُخ اور رفتار دیکھی۔ جی نہیں دھوئیں کی چادر کے لئے ہوا بہت زیادہ ہے لیکن میں یقیناً کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر آپ کہیں تو کوشش کروں۔"

واپسی کے قبل گڈھے میں سے کھڑے ہو کر ریگی نے نشانوں کو دوربین سے دیکھا۔ اور کرنل اور اڈجوٹنٹ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ نشانوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے اپنی دوربین بتائی اور کرنل کی طرف ہٹا تاکہ آخری حکم لے کر چلتا بنے۔ کرنل زمین پر ڈھیر کی طرح پڑا ہوا تھا۔ سر میں گولی لگ کر مر چکا تھا۔ یکدم سے وہ اڈجوٹنٹ کی طرف پلٹا۔ وہ بھی اسی طرح سر میں گولی لگنے کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔

چونکہ یہ اموات اس کے بغیر علم، دراچانک ہوئے تھے لہذا وہ گھبرا گیا۔ اور اسے خیال پیدا ہوا شاید کوئی تیسری گولی ہوا میں اس کے سر کی منتظر ہو۔ وہ فوراً جھکا اور آڑ ڈھونڈنے کے لئے یکدم دوڑا "یا خدا۔ کیا ہوا یکدم پیچھے سے آواز آئی" یہ سکنڈ نارتھ رائڈنگ رجمنٹ کے سیکنڈ اِن کمانڈ کی آواز تھی۔ جو اپنے کرنل کے پاس داہنی بازو پر زور پڑنے کی اطلاع دینے کے لئے آیا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں۔ میں دوربین سے نشانے دیکھ رہا تھا۔ اور جب میں پلٹا تو" . . . . .

خدا کی مار ان مشین گنوں پر۔ سیکنڈ اِن کمانڈ نے سرے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اسکے بعد نظر بچا کر اپنا اطمینان کر لیا کہ دونوں افسر مر چکے تھے۔" خیر اب میں اس معاملے کو دیکھوں گا" کرنل نے چند نشانے مجھے بتلائے تھے شاید آپ ان کو دیکھنا پسند کریں" ریگی نے کہا۔ سیکنڈ اِن کمانڈ نے جلدی سے نقشے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔" ان کی فکر مت کرو۔ ان کو میں نے ٹھیک کر لیا ہے۔"

حملہ آور انفنٹری کی طرف جاتے ہوئے سیکنڈ نارتھ رائڈنگ کے سیکنڈ اِن کمانڈ (جو اب افسر کمانڈنگ ہو گیا تھا) نے پوچھا تم نے اپنی دیکھ بھال کا اڈا کہاں جمایا ہے" یہاں ابھی ٹرک میں۔ لیکن اگر میں آپ کے ساتھ رہوں تو زیادہ مناسب ہو گا۔

ریگی نے جواب دیا۔ خیال تو اچھا ہے بشرطیکہ تم اپنی حفاظت کر سکو۔ سیکنڈ اِن کمانڈ نے کہا" ریگی کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ ابھی دو منٹ پہلے دو گورے موڑ کے بالکل قریب آ کر بیٹھے تھے ریگی نے اپنے میجر کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا مگر میجر اس کے لئے تیار نہ تھا۔ اور وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ ایسے افسروں کو بھیجنا صرف وقت خراب کرنا ہے۔ اس کے بعد بھی میجر نے

جواب دیا" ارے میاں چند جہاں تک تم سے ہو سکے ذرا ہشیاری برتنا۔ بیوقوفی سے کوئی فائدہ نہیں۔ "نہیں میجر بے فکر رہیئے۔ بیوقوفی کی کوئی حرکت نہ کروں گا اور پھر یہ تو کام کا معاملہ ہے"۔ وہ تیزی سے اپنی گاڑی سے اتر کر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جہاں سے اُسے انفنٹری صاف دکھلائی دے سکتی تھی۔ تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد وہ تیزی سے واپس آیا اور اپنے آپریٹر سے کہنے لگا وہ مائکروفون اور ائرفون تو دینا۔ یہ دونوں چیزیں لے کر وہ پیٹ کے بل پھر پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اور وہاں سے حکم دینے لگا نمبر ۲ ٹروپ نشانہ ڈان کنٹرول۔ چارج ۲۔ صفر۔ ۳۵۶ درجہ۔ زاویہ نگاہ ۲۰ فٹ کی اونچائی۔ فاصلہ ۶۲۰۰ گز۔ فائر۔ ڈان ٹروپ کے ٹیلیفون والے نے جواب میں سب احکامات اُسی طرح پڑھ کر دہرائے۔ اور گولہ اس کے سر پر سے سیٹی بجاتا ہوا گذر گیا۔ ریگی نے دوربین اُٹھا کر دیکھا کہ گولہ جنگل سے دو سو گز ادھر پڑا۔ اس نے پھر ٹیلیفون کیا۔ اور ۲ درجہ ۶۶۰۰۔ شاٹ ۳۔ اب کی ریگی نے دیکھا کہ گولہ بالکل جنگل میں جاکر گرا۔ اور اس نے ہر منٹ بعد گولے داغنے کا حکم دیا۔

جنگل سے شعلے نکلنا بند ہو گئے تھے۔ اور نارتھ رائڈنگ نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ جب وہ لوگ جنگل سے کوئی ۵۰ گز کے فاصلے پر رہ گئے تو ان لوگولے بند کرنے کا حکم دیدیا۔ اس نے سپاہیوں کو رائفلیں لئے ہوئے جنگل میں گھستے دیکھا۔ اور خود ہی کہا چلئے یہ کام بھی ختم ہوا۔ ساری دوپہر ریگی یہی حرکتیں کرتا پھرا۔ نارتھ رائیڈنگ کا بایئں بازو یکبارگی رُک گیا اور سیکنڈ ان کمانڈ تیزی سے ریگی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ بایئں بازو پر میل بھر پرے دو دبابے آگے بڑھے آرہے ہیں۔ بھلا ان کے لئے تم کیا کر سکتے ہو۔ ریگی نے سڑک کو دیکھ کر لاسلکی کے ذریعہ اپنے توپ خانہ کو نشانہ بتلایا۔ اور یہ بھی کہدیا کہ نشانہ متحرک ہے۔ اس نے جلدی سے فاصلہ کا اندازہ کیا اور حکم پر فائر کا آرڈر دے دیا۔ موقعہ لڑائی سے میلوں پیچھے گولے بھر دئے گئے تھے اور توپیں تیار کھڑی تھیں۔ کانوں پر ائرفون اور آنکھوں سے دوربین لگائے ریگی سڑک کو دیکھ رہا تھا اُس سے سیکنڈ ان کمانڈ نے کچھ کہا لیکن ان الفاظ کی ادائیگی سے پہلے ریگی نے گولے فائر کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ گولے دبابوں کے بالکل سامنے گرے۔ دونوں دبابے ٹھہر گئے۔ اور چونکہ دوسری دفعہ بھی گولے وہیں گرے تھے۔ اس لئے دبابے واپس مڑ گئے اب چونکہ ریگی نے فاصلے زائد کرنے کا حکم دیدیا تھا اس نے تیسری دفعہ گولے نغر سے اور کہیں جا گرے۔ کانوں سے ایرفون نکالتے ہوئے ریگی نے کہا۔ پیٹھ میں گھونسہ اسے ہی کہتے ہیں۔" بہت بہت خوب شکریہ سیکنڈ ان کمانڈ نے کہا اب ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اب پھر توپ خانے کی موٹر انفنٹری کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ریگی نے کئی دفعہ اپنے ڈرائیور سے کہا دیکھو ہم کس قدر خوش قسمت ہیں ہمارا بال بھی بیکا نہیں ہوا حالانکہ اس کے کوٹ کا آستین ایک گولی اُڑا لے گئی تھی اور اس کی موٹر کے ٹاپ میں چار گولیوں کے سوراخ تھے۔

بالکل جُھٹپٹے کے وقت چونکہ انفنٹری کھیتوں میں سے گذر رہی تھی اور ریگی کی موٹر اُن کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اسے کچھ دیر سڑک تلاش کرنے کے لئے رکنا پڑا تھوڑی دیر بعد ریگی کو پتہ چلا کہ وہ اپنے انفنٹری کے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہے۔ اس لئے پہلی سڑک جو اُسے نظر آرہی تھی اسی پر وہ بھاگ نکلا۔ چھوٹی سی پہاڑی پر سے گذر کر ایک گاؤں میں پہنچا یہاں لڑائی کے

کوئی آثار نہ تھے ابتک کبھی کبھی دور سے گولیوں کی آواز ضرور آرہی تھی۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ شاید انفنٹری گذر گئی ہوگی۔ اس نے ایک مکان کے پاس موٹر کھڑی کی اور انفنٹری کا پتہ لگانے کے لئے اوپر کی منزل پر چڑھ گیا کہ شاید وہاں سے کچھ دکھائی دیجائے۔ اسے موٹر سائیکلوں کی آواز آئی اس نے دیکھا کہ دشمن کے دو سپاہی موٹر سائیکلوں پر سوار آئے پیچھے لاریوں میں سپاہی بھرے ہوئے آئے اور ایک مکان میں داخل ہوگئے۔ ریگی بڑا گھبرایا۔ اور سوچنے لگا کیا کیا جائے۔ یہاں سے نکلنا چاہیئے مگر کس طرح نکلا جائے۔ یکدم اُسے ایک خیال آیا وہ دوڑ کر اپنی موٹر میں پہنچا۔ ڈرائیور اور وائرلس اپریٹر سے کہا چپکے بیٹھے رہو اور وائرلس کے ذریعہ اپنی رجمنٹ کو اسی گاؤں کا نشانہ دے کر گولے چلانے کے لئے حکم دیا۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہا ممکن ہے ہمیں خود اپنی توپوں سے نقصان پہنچے مگر کیا کیا جائے؟ اور انتظار کرنے لگا۔ اُسے ایسے معلوم ہوا گویا برسوں ہی انتظار کرتے گذر گئے حقیقت میں دو منٹ بھی نہیں گذرے تھے۔ یکدم توپوں کے گولے عمارتوں پر آ کر گرنے لگے اس شور میں ریگی نے اپنے ڈرائیور سے انجن سٹارٹ کرنے کے لئے کہا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پوری رفتار سے وہاں سے نکلا۔ دشمن کو ان کی مزاحمت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد رائفل کی آواز آنے لگی اور اس کی موٹر کے ٹاپ میں دو اور گولیوں نے اپنی یادگار کے نشان چھوڑے۔

سڑک پر ایک میل پرے سیکنڈ نارتھ رائڈنگ رجمنٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ ملا اس سے ریگی نے سب واقعات بتلائے۔ اس نے جواب دیا "یہ میری عمر میں پہلا موقعہ ہے کہ کسی نے خود اپنے آپ کو توپوں کا نشانہ بنایا ہو۔ بہت خوب بیکن جانتے ہو تم نے میرا کام ہلکا کر دیا۔ ہمیں وہ مقام لینا بھی تھا اب ہم سیدھے وہاں چلے جائیں گے۔"

" ریگی نے کہا بہت خوب اگر آپ وہاں تشریف لے جا رہے ہیں تو میں گولہ باری بند کرائے دیتا ہوں" گولوں کی آڑ میں سیکنڈ ان کمانڈ اس گاؤں میں داخل ہوا۔ ریگی خود بھی ساتھ ہی تھا۔ اس قدر پریشانیوں کے باوجود سیکنڈ اِن کمانڈ کے ہمراہی وہ فرحت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے توپ خانے کے ہیڈ کوارٹر کو ٹیلیفون کیا کہ آج دن کا کام ختم ہو چکا ہے۔ توپخانے کے میجر نے جواب دیا "ایک گھنٹہ کے اندر دوسرا آدمی تمہاری جگہ بھیج رہا ہوں۔

گھنٹے بھر بعد ریگی اپنے میجر کے ڈیرے پر واپس آ چکا تھا۔ اس نے اپنے میجر کو سب باتیں بتلائیں مگر نارتھ رائڈنگ کے کمانڈنگ افسر اور اڈجوٹنٹ کی موت کا واقعہ اور یہ گاؤں والا قصّہ نہ بتلایا۔ وہ اس وقت صرف اکیلا رہنا چاہتا تھا رپورٹ دے کر یکدم باہر نکل گیا۔ اور گھاس کے ایک گٹھے کے پیچھے بیٹھ کر سگار جلایا اور ریڈیو پر موسیقی سننے لگا۔ کوئی راگ ہو اس سے مطلب نہیں مگر ہو موسیقی وہ اپنے اعصاب کو ٹھیک کرنا چاہتا تھا اور اعصاب کے ٹھیک کرنے کے لئے موسیقی سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں۔ سگار منہ میں لئے وہ موسیقی سنتا رہا۔ اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد خود ہی کہنے لگا۔ آج جو حرکتیں میں نے کی یقینی کوئی گدھے سے گدھا بھی نہیں کرے گا۔

رات کے وقت سیکنڈ رائڈنگ رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ نے ریگی کے میجر کو سب واقعات بتلائے اور کہا کیجیے وہ

آپ کا پہلے چہرہ والا افسر بھی واپس آیا یا نہیں۔ خوب آدمی ہے آج اس نے سیکڑوں آدمیوں کی جان بچائی ہے۔ اس گفتگو کے بعد میجر نے لکھنا شروع کیا۔

بخدمت افسر کمانڈنگ ۶۶۶ فیلڈ رجمنٹ ار۔اے

مقدمہ سفارش۔

لفٹنٹ ار انگلش .... ان وجوہات کی بنا پر میں اُمید کرتا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ لفٹنٹ ریگی انگلش کو ملٹری کراس دیا جائے۔

اس نے ایک ڈیسپیچ رائڈر کو بلا کر یہ خط دیا اور کہا ابھی ہیڈکوارٹرس میں لے جا کر دیدو۔ فقط

افکارِ یقین

جناب امام الدین یقین

ہیں تلخیاں سرور بہ داماں لئے ہوئے ۔۔۔ موت آتی ہے حیات کا ساماں لئے ہوئے

تفسیرِ حق کا کس کو یہاں ادعا رہا ۔۔۔ اپنا وجود آپ ہے قرآں لئے ہوئے

ہر اشک چشمِ تر کا ہے اک بحرِ بیکراں ۔۔۔ اور بحر ہے حوادثِ طوفاں لئے ہوئے

دانے بکھیرتا ہے جو صیّادِ دام پر ۔۔۔ دستِ کرم ہے دعوتِ زنداں لئے ہوئے

اک وہ بھی ہیں کہ جن کی گذرتی ہے عیش میں ۔۔۔ اک ہم ہیں یاس و حسرتِ حرماں لئے ہوئے

فرطِ غمِ فراق نے غم کو مٹا دیا ۔۔۔ اب درد خود ہے درد کا درماں لئے ہوئے

(مقطع) تجھ کو یقین قبر کی ظلمت کا خوف کیا
ہر داغِ دل ہے مہرِ درخشاں لئے ہوئے

از سید مظہر الدین حسن ۔ مظہر

غالب کے نام سے کون اردو دان واقف نہیں ۔ لیکن شاید پچیس فیصدی ایسی ہستیاں ہوں گی جنہوں نے غالب کی سوانح کا مطالعہ کیا ہے ـــــ بقول حضرت حالیؔ "ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا' ان کے کاموں میں چھان بین' ان کے نوادر افکار سے مستفید ہونا قوم کا فریضہ ہے" ـــــ حضرت حالیؔ کی تصنیف "یادگار غالب" سے چند ایسے خاص اردو اشعار جو ضرب المثل ہیں اُن کے محاسن و مواقع اور بعض ایسے حالات جو خاص حیثیت رکھتے ہیں' نہایت مختصر صورت میں ناظرین ارمؔ کے لئے تراش رہا ہوں ـ لیکن اس کا یہہ مطلب نہیں کہ اس کتاب سے صرف بلند اور پاکیزہ خیالات چن لئے گئے ہیں ! نہیں بلکہ رسالہ کی وسعت کے موافق ہر ایک صنف میں کچھ ایسا حصہ جو عام مذاق سے بیگانہ اور فہم سے بعید تر نہ ہو لے لیا گیا ہے۔

مظہر

ولادت اور خاندان

مرزا اسد اللہ خاں المعروف بہ میرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالبؔ ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے ۔ ان کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے ۔ اور ان کا سلسلۂ نسب تورؔ ابن فریدون تک پہونچتا ہے ـــ تب کیانی تمام ایران اور توران پر مسلط ہو گئے ایک مدت دراز تک تورؔ کی نسل ملک اور دولت سے بے نصیب رہی' مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی ـــ ترکوں میں قدیم رسم تھی کہ باپ کے متروکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا کچھ نہ ملتا تھا' اور سب کچھ بیٹی کے حصہ میں آتا تھا ۔ ایک مدت کے بعد اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ لی اور کئی سو برس تمام ایرانؔ تورانؔ شامؔ و رومؔ ۔ یعنی (ایشائے کوچک) پر حکمران رہے ۔ اس کے بعد سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر ہو گئی ـــــ انہیں میں سے ترسم خاں ایک امیرزادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ مرزا غالبؔ کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے تھے وہ ترسم خاں کی اولاد میں سے تھے ۔

غالب کے دادے کی زبان خالص ترکی تھی' نجف خاں نے ان کو سلطنت کی حیثیت کے موافق منصب دلوادی تھی ان کے کئی لڑکے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہو سکے ہیں' ایک تو غالبؔ کے والد عبد اللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا ۔

دوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کیدان کی بیٹی سے ہوئی۔ جو سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر تھے۔ غالب کے والد نے بطور خانہ دامادی اپنی عمر کا زیادہ حصہ سسرال میں گذارا اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔ ان کے دو لڑکے تھے مرزا غالب دوسرے مرزا یوسف خاں جو بعمر شباب مجنون ہو کر ۱۸۵۷ء میں راہی عدم ہوئے
غالب کے والد کچھ عرصہ آصف الدولہ کے ہاں ملازم رہے۔ اور کچھ عرصہ حیدرآباد سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت پر کارگذار رہ کر آگرہ واپس گئے ـــــ بعد کو آلور کا قصد کیا' راجہ بختاور سنگھ نے ان کو ابھی کوئی خاطر خواہ خدمت نہیں دی تھی کہ انہیں دنوں میں گڑھی کے زمیندار راج سے تفرقہ ہوا۔ جو فوج گڑھی کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی تھی۔ اس میں غالب کے والد مارے گئے۔ اور راج گڈھ میں دفن ہوئے ـــــ ان کے انتقال کے بعد راجہ بختاور سنگھ نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرحوم کے دونوں بچوں کے لئے مقرر کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد غالب اور ان کے بھائی یوسف خاں کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ خاں نے کی۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہو گئی اور (نصر اللہ خاں کے سسر) نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں لارڈ لیک کے لشکر میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے مرزا غالب کے چچا یعنی اپنے داماد نصر اللہ خاں کو بھی فوج میں بعہدہٗ رسالدار ملازم کرا دیا۔ ـــــ ان کو رسالہ کی تنخواہ میں دو پرگنے آگرہ کی نواح میں دئے گئے تھے۔ یہ دونوں تاحیات نامزد رہے۔ اس کے بعد سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست سے ان کے متعلقین کے نام پنشن جاری کروا دی۔ جس سے سات سو روپیہ سالانہ غالب کو ملتا رہا۔ مگر فتح دہلی کے تین برس بعد تک پنشن بند رہی۔ جب غالب کی ہر طرح سے برئیت ہو گئی۔ اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی ـــــ اس دوران تین سال میں غالب سے احباب کو نہایت تعلق خاطر رہا اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میر مہدی نے خط لکھا' اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

لطیفہ۔ "میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھے آ گیا ہے اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ ہے روزے کھا کھا کر کاٹ رہا ہوں آگے خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرہ ہی میں رہے' شادی کے کچھ عرصہ کے بعد دلی میں سکونت اختیار کر لی' مرزا غالب کی شادی بھی فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور ۱۳ سال کی عمر میں سات رجب ۱۲۲۵ھ کو عقد ہوا'

تعلیم ۔ آگرے کے ایک نامی معلم شیخ معظم سے غالب نے تعلیم حاصل کی ـــــ ایک پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں' ہرمز' تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا' بسلسلۂ سیاحت آگرہ آیا اور غالب سے ملاقات ہوئی۔ جب غالب دلی گئے وہ بھی ساتھ گیا۔ بہرکیف یہ غالب کے ہاں دو سال رہا۔ غالب نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت

حاصل کی — اس میں شک نہیں عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا۔ لیکن عربی زبان کا بھی بہت فاضل تھا۔ غالب کے لئے ایسے کامل اور جامع اللسانین کی صحبت نوادرِ اتفاقات میں سے تھی چنانچہ غالب نے اکثر تحریروں میں عبدالصمد کے تلمذ پر فخر کیا ہے — غالب کے حُسنِ قابلیت اور حُسنِ استعداد نے بھی ملا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش جما دیا تھا۔ ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مرزا غالب کو نہیں بھولا۔

زمانۂ شباب :-

مرزا غالب عنفوان شباب میں شہر کے نہایت حسین اور خوشرو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں بھی وجاہت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت، ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ آخر وقت تک بہت چکلا ہاڑ قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے۔ اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

مسکن :-

دلی میں ان کا قیام تقریباً پچاس برس رہا۔ لیکن انہوں نے کوئی ذاتی مکان نہیں رکھا ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہا کرتے جب ایک مکان سے جی اکتا جاتا تو دوسرے مکان میں چلے جاتے۔ آخری مکان جس میں ان کا انتقال ہوا ہے مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ خدا ہے

مطالعہ و قوتِ حافظہ :-

جس طرح غالب نے تمام عمر رہنے کے لئے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعہ کے لئے کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی۔ باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گذری۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے اور مطالعہ کے بعد واپس کر دیتے لیکن جس کتاب کو ایک مرتبہ پڑھ لیا اس کا ایک ایک جملہ ذہن میں محفوظ ہو گیا۔

سفر :-

مرزا غالب نے کلکتہ کے سوا کوئی لمبا سفر نہیں کیا۔ اس سفر میں چند ماہ لکھنؤ اور بنارس ٹھیرے تھے، کلکتہ جانے کا سبب تھا کہ غالب کے چچا نصر اللہ خاں کی وفات کے بعد وارثوں کے لئے جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروزپور جھرکہ پر محول کردی تھی۔ اس وقت غالب کی عمر ۹ برس کی تھی۔ جب سنِ تمیز کو پہونچے، شادی ہوگئی، عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بڑھ گئیں، صحیح یا غلط انہیں معلوم ہوا کہ فیروزپور سے گورنمنٹ نے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لئے مقرر کی ہے اتنی نہیں ملتی۔ چنانچہ کلکتہ سوپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کیا۔ پورے دو سال کلکتہ میں رہے لیکن ناکامی ہوئی۔

مختلف اغراض کے تحت غالب نے گورنمنٹ میں پانچ درخواستیں دیں جس میں سے آخری درخواست خطاب اور خلعت کی تھی گورنمنٹ سے غالب کو کوئی خطاب نہیں ملا۔ البتہ لوکل گورنمنٹ سے اُن کو 'خان صاحب' 'بسیار مہربان'

لکھا جاتا تھا۔ اور جب کبھی دلی میں وائسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا۔ ان کو بھی مثل دیگر روسا و عمائد شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید ملتا رہا۔

مجادلہ اہل کلکتہ۔

کلکتہ کے قیام میں کچھ لوگوں نے مرزا غالب کے کلام پر اعتراضات کئے، اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سند آپیش کیا۔ مگر مرزا غالب ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں سے خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے، قتیل کا نام سن کر بھوں چڑھائی۔ اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ کھتری کے قول کو نہیں مانتا۔ اہل ہند میں سوائے خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے، اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوگیا ـــــــ اگرچہ غالب کے طرفدار بھی کلکتہ میں بہت تھے مگر چونکہ مرزا غالب اعتراض اور مخالفت سے بہت جزو بز ہوتے تھے اس لئے ان کے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ انہوں نے تنگ آکر ایک مثنوی موسوم بہ باد مخالف لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی، اور اہل کلکتہ کی نامہربانی اُن کے اعتراضات، اپنے جوابات مع اقوال اہل زبان نہایت عمدگی سے بیان کئے ہیں۔

قیام لکھنؤ۔

مرزا غالب نے دلی سے کلکتے جانیکا ارادہ کیا تو راہ میں ٹھہرنیکا قصد نہ تھا مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ غالب ایک بار لکھنؤ آئیں ـــــ اس لئے کانپور پہونچ کر انہیں خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔

اہل لکھنؤ نے ان کی عمدہ طور پر مدارات کیں۔ اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ ان کی ایک تقریب قرار پائی ـــ غالب نے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہ ہوسکا تھا۔ البتہ ایک سہ نثر جوان کے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت روشن الدولہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی۔ لیکن غالب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ایک یہ کہ نائب مری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھیں ــــــ چنانچہ غالب بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور نثر پیش کریں کلکتہ روانہ ہو گئے۔

لطیفہ۔

دلی میں رتھ کو بعضے مونث کہتے ہیں۔ اور بعض مذکر، کسی نے غالب سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مذکر ہے یا مونث؟ آپ نے کہا بھیا جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث سمجھو، اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکر۔

سرکاری ملازمت سے انکار۔

دہلی کالج جب نئے اصول پر قائم ہوا تو مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند مدرسین کے انتخاب کے لئے دہلی گئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ ماہوار کا ایک مدرس عربی کا مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا بھی مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے غالب، مومن خاں

وغیرہ کا نام پیش کیا، سب سے پہلے غالبؔ کو بلایا گیا، غالب پالکی میں سوار ہو کر صاحب موصوف کے ڈیرے پر پہونچے صاحب کو اطلاع ہوئی انھوں نے فوراً بلا لیا، لیکن غالب پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب لینے آئیں گے۔ جب صاحب کو وجہ معلوم ہوئی وہ خود باہر چلے آئے اور کہا کہ جب آپ دربارِ گورنری میں تشریف لائیں گے آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت آپ نوکری کی غرض سے آئے ہیں۔

غالبؔ نے کہا گورنمنٹ کی نوکری کا ارادہ اس لئے کیا تھا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آجائے ــــــ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں، غالب نے کہا مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔

قید ہونیکا واقعہ :ــ

غالبؔ کو شطرنج اور چوسر سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس چوسر کی بدولت ۱۲۶۲ھ میں غالبؔ پر ایک ناگوار واقعہ گذرا۔ مجسٹریٹ ناواقف تھا، کوتوال مخالف، کوتوال کی مخالفانہ سعی نے ۶ ماہ کی قید کرا دی۔ قید کے زمانہ میں غالبؔ کو ہر طرح کی آزادی رہی، کھانا کپڑا اور تمام ضروریات حسب دلخواہ گھر سے پہونچتی تھیں، صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک علٰحدہ کمرے میں رکھے گئے تھے، ان کے ایک دوست نے اپیل کی اور اپنی ذاتی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجہ میں ۳ ماہ کی قید منسوخ کروادی۔ یہ واقعہ غالبؔ پر بہت شاق گذرا، چونکہ شہر کے شرفاء اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اس کو وہ بڑی بے آبروئی سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کو ایک فارسی خط میں لکھا ہے جس کے آخری الفاظ ہیں۔ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جاتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے اس پر راضی ہوں ــــ مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں بھی تو ہندوستان میں نہیں۔ روم، مصر، ایران، بغداد، یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے۔

لطیفہ :ــ

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو اپنے دوست میاں کالے کے ہاں ٹھیرے، کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارکباد دی۔ غالبؔ نے کہا کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے؟ پہلے گورے کی قید میں تھے اب کالے کی قید میں ہوں۔

۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے غالبؔ کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید دربارِ عام میں مرحمت فرمایا۔ اور خاندان تیموری کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا، اور یہ قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم رضی اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں میں سے مضامین انتخاب کر کے مرزا غالبؔ کے حوالہ کیا کریں اور غالبؔ ان مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں۔

سنہ ۱۲۷۱ھ میں جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی غالب سے متعلق ہوگئی۔ ایک روز غالب دیوان عام میں بیٹھے ہوئے تھے' چوبدار نے آکر کہا کہ حضور غزلیں مانگ رہے ہیں' غالب نے اپنے آدمی سے کہا' پالکی میں کچھ کاغذات رومال میں بندھے رکھے ہیں لے آؤ' آٹھ نو پرچے تھے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے۔ اسی وقت مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھکر چوبدار کے حوالہ کیں۔

بدیہہ گوئی:-

کلکتہ کی ایک مجلس میں جہاں غالب بھی موجود تھے شعراء کا ذکر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی' غالب نے کہا فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔ اس پر بات بڑھی' اُس شخص نے کہا فیضی جب پہلی بار اکبر کے روبرو گیا اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہکر پڑھا تھا۔ غالب نے کہا' اب بھی اللہ کے بندے دو چار سو نہیں تو دو چار اشعار ہر موقعہ پر فی البدیہہ کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے۔ ایک چکنی ڈلی پیش کی اور درخواست کی کہ اس پر کچھ ارشاد ہو۔ غالب نے گیارہ شعر کا ایک قصیدہ اسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا جو ان کے دیوان ریختہ میں موجود ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے ؎

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیئے

اولاد:-

غالب کے ابتداء میں سات بچے ہوئے لیکن کوئی زندہ نہیں رہا۔ غدر سے پہلے ان کی بی بی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کا جب انتقال ہوا تو ان کے دو لڑکوں " باقر علی خاں و حسین علی خاں " کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا افسوس ہے کہ دونوں بھی غالب کی وفات کے بعد تھوڑے تھوڑے عرصہ سے فوت ہوگئے۔

عارف سے غالب کو صد درجہ تعلق تھا۔ ایک قرابت کے سبب سے۔ اور زیادہ اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے جب وہ جوان عمری میں فوت ہوگئے۔ تو غالب اور ان کی بی بی پر سخت صدمہ گذرا' غالب نے ان کی وفات پر ایک غزل بطور نوحہ لکھی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے... کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

غدر :-

فتنہ اٹھا، اور حالات نے نہایت ہی وحشت ناک صورت اختیار کر لی۔ مہاراجہ پٹیالہ کی جانب سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُن کے ہمسایوں کے مکانوں پر پہرہ بیٹھ گیا تھا۔ جس میں سے ایک غالب بھی تھے۔ اس لئے غالب فتح مند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے پھر بھی ان کو طرح طرح کی کلفتیں اٹھانی پڑیں۔ — مرزا غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہو گئے تھے اور آخر دم تک اسی حالت میں رہے، ان کا مکان غالب کے مکان سے قریب ہی تھا، جب دلی فتح ہو گئی۔ اور راستے بند ہو گئے تو غالب اپنے بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے، رہنے سہنے، مرنے جینے کی کوئی خبر نہ تھی، ایک روز خبر ملی کہ مرزا یوسف کے گھر میں بھی کچھ سپاہی گھسے اور جو کچھ ملا لوٹ لے گئے۔ چندروز بعد پھر اطلاع ملی کہ پانچ دن تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا، اس وقت کفن کے لئے بازار میں کپڑا مل سکتا تھا۔ نہ غسال نہ گورکن نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا مگر غالب کے ہمسایوں نے ان کی مدد کی پٹیالہ فوج کے ایک سپاہی کے گھر سے دو دھلی ہوئی چادریں لے کر مرزا یوسف کے مکان پر پہونچے، اور بعد تجہیز و تکفین ایک مسجد کے صحن میں جو مکان سے بالکل قریب تھی، دفن کیا — — — غالب نے اپنے بھائی کی تاریخ وفات اس طرح لکھی

ع
زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف — کہ زیستے بجہاں در رز خویش بیگانہ
بچے ز انجمن از من ہمی پژوہش کرد — کشید م آہ بگفتم دریغ دیوانہ
۱۲ ۔ ۔ ۱۲۷۱

اس میں لفظ آہ کا تخرجہ دریغ دیوانہ میں سے کیا گیا ہے۔

ایک روز کچھ گورے غالب کے مکان میں بھی گھس آئے لیکن گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا۔ غالب اور ان کے دونوں بچوں اور نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل براون کے روبرو پیش کیا۔ براون نے نہایت نرمی اور انسانیت سے حال دریافت کیا۔

لطیفہ :-

غالب جب کرنل براون کے روبرو گئے تو ان کے سر پر کلاہ پاپاخ تھی۔ اس نے غالب کی نئی وضع دیکھ کر دریافت کیا ! ول تم مسلمان ؟ غالب نے کہا ! آدھا۔ کرنل نے کہا ! اس کا کیا مطلب غالب نے کہا، شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ کرنل یہ سن کر ہنسنے لگا۔ پھر غالب نے وزیر ہند کی چٹھی۔ جو ملکہ معظمہ کے مدحیہ قصیدہ کی رسید اور جواب میں آئی تھی دکھائی۔ کرنل نے کہا تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہیں حاضر ہوئے، مرزا غالب نے کہا میں چار کہاروں کا امیر ہوں۔ وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے میں کیونکر حاضر ہوتا۔

غالب کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے۔ سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ، سو یہ دونوں بند ہو گئے تھے،

اس کے سوا گھر میں جو کچھ بی بی کا زیور تھا جب شہر لٹنے لگا تو دوسری جگہ دفن کر دیا گیا تھا اُس کو بھی فتح مند سپاہ نے کھود کر نکال لیا۔ مگر غالب نے اس تنگی اور عسرت کے زمانے میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا، جو حالت ان پر خوش و ناخوش گزری اس میں نوکر بھی برابر شریک رہے۔ اس کے علاوہ غالب جن لوگوں کے ساتھ امن کے زمانے میں سلوک کیا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں بھی غالب کو مجبور کیا کرتے، اور چار و ناچار غالب کو ان کی بھی خبر لینی پڑتی تھی۔

غالب لکھتے ہیں اس ناداری کے زمانے میں، جس قدر کپڑا، اوڑھنا، بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھایا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے ہیں اور ہم کپڑا ———— غدر کے بعد دو سال تک غالب کا یہی حال رہا دو برس بعد نواب یوسف علیخاں مرحوم رئیس رامپور نے سو روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لئے مقرر کر دیا۔ جو غالب کو آخر دم تک ملتا رہا۔ تین برس بعد جب غالب ہر ایک الزام سے بَری ثابت ہوئے تو سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی۔

عربی استعداد :-

غالب نے عربی میں صرف و نحو کے سوا استاد سے اور کچھ نہیں پڑھا لیکن اُنھوں نے عربی الفاظ کو اپنی اُردو اور فارسی شاعری میں اس سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے جس طرح ایک کامل فاضل کو کرنا چاہیئے۔

فارسی دانی :-

فارسی میں غالب کو اس قدر عبور تھا کہ خود ایران کے مستند "اہل زبان" شعراء کو اس قدر عبور نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کو فارسی داں ماحول ملا۔ لیکن پھر بھی ہندوستان میں "جہاں کی عام زبان اُردو ہے" پل کر فارسی میں اس قدر کمال حاصل کرنا قابل غور ہے۔

علم نجوم سے غالب کو کافی واقفیت تھی۔ علم تصوف سے بھی ان کو خاص لگاؤ تھا حقائق اور معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے دیکھا کرتے تھے۔

خط و شعر خوانی :-

غالب کا خط نستعلیق تھا۔ باوجود خوشخطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے، شعر پڑھنے کا انداز بھی موثر اور دلکش تھا۔ ان کے طرز میں ایک خاص کیفیت تھی۔

وسعت اخلاق :-

غالب کے اخلاق نہایت وسیع تھے، ہر ایک شخص سے، جو اُن سے ملنے جاتا نہایت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے، دوستوں سے ایک خاص اُنسیت تھی، ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین رہتے تھے، ان کے دوست ہر ملت و مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے، ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوط کے جواب میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔

غزلوں کی اصلاح کے سوا طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص اور مخلص دوست کرتے رہتے تھے، اور غالب کے لئے ان کا تکملہ فرض تھا ـــــــ مروت اور لحاظ ان کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ آخر عمر میں اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے۔ بایں ہمہ کبھی کسی کی غزل یا قصیدہ واپس نہیں کیا۔

لطیفہ:۔

ایک دفعہ مرزا تفتہ نے لکھا، "آپ نے بسبب ذوقِ سخن اصلاحِ اشعار منظور فرمائی ہے" غالب نے جواب دیا۔ لاحول ولا قوۃ، کس ملعون نے بسبب ذوق اشعار کی اصلاح منظور رکھی ہے! اگر میں اصلاح سے بیزار نہیں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق "قہر درویش بجان درویش" لکھا تھا ـــــــ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔

لطیفہ:۔

غالب اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں ـــــــ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجالایا، اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا اور اصلاح دیتا، اب آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے، شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبرسِن خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کر دی تھی، میں متوقع ہوں کہ مرے دوست بھی اصلاحِ اشعار کی خدمت سے مجھے معاف کر دیں گے۔

یادداشت:۔

پچھلے صفحوں میں غالب کے حافظہ کا ذکر کیا جا چکا ہے، اور بتلایا جا چکا ہے کہ غالب نے کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی ہمیشہ کرائے یا مانگے کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، لیکن جو کام کی باتیں ہوتیں وہ ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھیں۔ فکرِ اشعار کا طریقہ تھا کہ رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے، اور جب کوئی شعر سرانجام ہوتا، کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے۔ اسی طرح آٹھ دس گرہ لگا کر سوتے تھے۔ اور دوسرے دن صرف یادداشت پر سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے۔

ظرافت:۔

غالب کی تحریر، نظم، نثر، ظرافت سے معمور ہے، اور اسی لئے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے، وہ بہت کم بولتے تھے، مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ لطف سے خالی نہ ہوتا، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ ان کو حیوانِ ناطق کے بجائے حیوانِ ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔

لطیفہ:۔

ایک دفعہ غالب ختم رمضان پر جب قلعے میں گئے تو بادشاہ نے دریافت فرمایا، غالب تم نے کتنے روزے رکھے ہیں؟ غالب نے جواب دیا، پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔

لطیفہ:-

ایک مجلس میں جہاں شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انہوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ غالب نے کہا میں تم کو میری سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔

لطیفہ:-

رمضان کے مہینے میں غالب اپنے ایک دوست کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے، اس وقت مولانا آزردہ پہونچ گئے اور چوسر کھیلتے دیکھ کر فرمایا ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان میں شیطان مقید رہتا ہے۔ مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا، غالب نے کہا! قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری ہے۔

خودداری:-

باوجودیکہ غالب کی آمدنی خرچ کے اعتبار سے بہت کم تھی، مگر خودداری اور حفظ وضع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ شہر کے امرار و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ جو شخص ان کے مکان پر آتا تھا، یہ اُن کے مکان پر ضرور جاتے۔ ایک روز ان کے ایک دوست "چرٹ" میں سوار ہو کر غالب کے مکان پر سے بغیر ملے نکل گئے۔ غالب کو جیسے ہی معلوم ہوا انہوں نے ایک پرچہ لکھا، ——— آج مجھے بے حد ندامت ہوئی شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں ——— جب یہ چٹھی ان صاحب کو ملی تو بہت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت غالب سے آکر ملے۔

اسلام غالب کی نظر میں:-

غالب اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل مقصد سمجھتے تھے۔ توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر ہے۔ انہوں نے عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک تو توحید وجودی دوسرے نبی کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے: جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے غالب بھی اس کے قائل نہ تھے، چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنی شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ناقدردانی کی شکایت:-

ایک روز غالب قلعے سے بعد سے اپنے ایک دوست کے ہاں آئے اور کہنے لگے کہ آج حضور نے ہماری

بڑی قدردانی فرمائی، عید کی مبارکباد میں ایک قصیدہ لکھکر لے گیا تھا، جب پڑھ چکا تو ارشاد ہوا، کہ مرزا تم پڑھتے خوب ہو۔ غالب دیر تک اپنے دوست سے زمانے کی ناقدردانی پر افسوس کرتے رہے "۔

غالب کو مرثیہ گوئی سے قطعی دلچسپی نہ تھی ایک بار فرمائش ہوئی کہ سید الشہداء کا مرثیہ لکھیں، حکم کی تعمیل کے لئے مرثیہ لکھنے بیٹھ گئے، اور بمشکل تمام مسدس کے تین بند لکھے۔ اور فرمایا کہ یہ تین بند صرف امتثال امر کے لئے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو

اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی

اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

مولوی عبدالقادر راجپوری نے جو نہایت ظریف الطبع انسان تھے مرزا غالب سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے پڑھ دئے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال — پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب یہ سن کر سخت حیران ہوئے۔ اور کہا کہ جناب یہ شعر میں نے آپ ہی کے دیوان میں دیکھا ہے۔ اگر دیوان موجود ہو تو دکھا دوں۔

گویا عبدالقادر غالب کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ آپ کے دیوان میں اس قسم کے شعر ہوتے ہیں ——

غالب نے اس قسم کے نکتہ چینیوں پر جا بجا اشارہ کیا ہے جس میں سے ایک اُردو شعر ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لکھنا پڑھنا یا گھبرانا

میں لکھنے پڑھنے سے بہت گھبراتی ہوں مگر جب کچھ کام ہوا اور میں بیکاری سے گھبرانے لگی تو لکھنا شروع کردیتی ہوں۔ لکھنے سے گھبرائی تو پڑھنے لگی اور اگر پڑھنے سے بھی گھبرا گئی تو کوئی اور کام کرنے لگی۔ مختصر یہ کہ لکھنا پڑھنا اور گھبرانا بس یہی میری زندگی کا گورکھ دھندا ہے۔

اس وقت میں لکھ رہی ہوں۔ دو چار سطریں اب تک جو میں نے لکھدی ہیں وہ تو آپ نے پڑھ لی ہوں گی اور یقیناً گھبراہٹ میں شروع ہوی ہونگی۔ مگر میں اس سوچ میں ہوں کہ اتنا سب لکھنے سے پہلے میں پڑھ رہی تھی اور پڑھنے سے گھبرا کر لکھنے لگی یا کوئی اور کام کر رہی تھی جس سے گھبرا کر لکھنے لگی سچ سچ کہدوں ؟ سنئے

ارم کا سالنامہ نکلنے والا ہے اور اس کے لئے مجھے کچھ لکھنا ہے اس خیال کے آتے ہی میں جو گھبرائی ہوں تو لکھنا شروع کر دیا۔ گھبراہٹ میں لکھا کس طرح جاتا ہے ؟ یہ آپ ضرور پوچھیں گے اگر یہ پوچھنے والے ہوں تو ہماری خاطر پوچھ لیجئے کیونکہ مجھے ایک اچھا سا جواب سوجھا ہے جس کو میں لکھنا چاہتی ہوں ہاں تو "کس طرح لکھا جاتا ہے" کا جواب سمجھنے کے لئے مجھے لکھنا اور آپ کو کچھ پڑھنا پڑے گا مگر مشکل یہ ہے کہ میں کچھ لکھوں تو ساری محنت بیکار جائیگی اس لئے بہتر یہ ہیکہ نہ میں کچھ لکھوں اور نہ آپ کچھ پڑھیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ وہ میرا اچھا سا جواب کدھر گیا ؟ اس کا میرے پاس تو کوئی جواب نہیں۔

ہاں تو سالنامے میں کچھ لکھنے کا خیال آیا اور ساتھ ہی مددگار مدیر صاحب کی یاددہانی کی چٹھی جو ملی میری تو گھبراہٹ شروع ہوئی کہ واقعی کچھ لکھنا ہی ہوگا۔ بھلا بتلایئے جنگ کی پریشانیوں میں کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔ یہ تو پڑھنے اور گھبرانے کا زمانہ ہے۔ اگر طبیعت موزوں ہوگی اور میں نے ایک آدہ صفحہ لکھ بھی ڈالا اور ادبی نگران صاحب کے پاس بھیج دیا تو مارے غصہ کے وہ پڑھیں گے بھی نہیں اور نہ صرف یہ بلکہ آیندہ کچھ لکھنے سے بھی منع کر دیں گے۔ اور اگر انھوں نے چھاپنے کی اجازت بھی دے دی تو اس کو پڑھے گا کون ؟ اور اگر کوئی پڑھنے والا مل گیا اور پڑھنے کے بعد اس کو گھبراہٹ ہو تو ؟

حیران باتوں کو چھوڑیئے مددگار صاحب کی یاددہانی والی چٹھی دیکھنے کے بعد میں سوچنے لگی کہ آخر لکھوں کیا ؟ بہ الفاظ دیگر ناظرین میری کونسی لکھی ہوئی چیز پڑھنا پسند کریں گے ؟ نظم ، ڈرامہ ، افسانہ ، قصہ ، کہانی ، مکالمہ ،

بحث، مقالہ، مضمون، سوانح عمری، ڈائری، خط!!! جب کچھ سمجھ میں نہ آیا اور میں لگی پریشان ہونے تو میں نے دل میں کہا چلو دھوبن آگئی ہے کپڑے ہی لکھ ڈالو۔ جناب کپڑے لکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ آنکھ، کان، ناک، ہاتھ ان سب کو بیک وقت مشغول و مصروف رکھنا پڑتا ہے اسی لئے اس کام سے بالعموم مجھے الجھن سی ہوتی ہے۔ کپڑوں کی زیادتی خصوصاً جب دھوبن دیر سے آتی ہے تو مجھے اچھی طرح محسوس ہوجاتا ہے کہ حواس کے کاموں میں کتنا اضافہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ وہ دیر ہی سے آئی تھی لہذا میں گھبرا گئی اور تھوڑا بہت لکھنے کے بعد میں نے پنسل کاپی اور بقیہ کپڑے چھوٹی بہن کو جائزہ میں دئے اور خود اخبار پڑھنے لگی۔ آجکل اخبارات بھی عجیب ہوگئے ہیں جس کالم پر نظر ڈالو جنگ کی خبریں اشتہار کو دیکھو جنگ کا حوالہ طبیعت نہ گھبرائے تو کیا ہو میں سمجھتی ہوں کہ محاذ جنگ پر اگر سپاہیوں کو اخبار پڑھنے کے لئے ملیں تو وہ بھی انہیں پڑھتے پڑھتے گھبرانے لگیں اور اسی گھبراہٹ میں اپنے کسی عزیز کو خط لکھنے کا موقعہ مل جائے تو عزیب عزیز اس خط کو پڑھ کر چکرا جائے۔

اتفاق سے نظر ایک ایسے کالم پر پڑی جہاں زنانہ کالج کا ذکر تھا میں نے جلد جلد پڑھنا شروع کیا۔ خبر میں وہی لکھا تھا جس کا خدشہ تھا۔ میں نے پوری خبر کیا پڑھی تقدیر کا لکھا پڑھا اور پھر گھبرانے لگی۔ لکھنے سے گھبرا کر پڑھنے لگی تھی اب پڑھنے سے جو گھبرائی تو سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ کوئی اور کام کرتی ——— اسی سوچ میں تھی کہ اپنی استانی صاحبہ کے مضمون کا لکھا ہوا ایک جملہ یاد آیا ——— "جو جتنا زیادہ پڑھے گا اتنا ہی اچھا لکھ سکے گا" مجھے یہ فکر ہوئی کہ جب زیادہ پڑھنے والا اچھا لکھ سکتا ہے تو اچھا لکھنے والا زیادہ پڑھتا ہوگا۔ اگر کوئی شخص زیادہ نہ پڑھے مگر اچھا لکھ سکے یا اچھا نہ لکھ سکے مگر زیادہ پڑھے تو کیا اس کی وجہ سے اس شخص کی صلاحیت پر حرف آتا ہے یا استانی صاحبہ کے نظریہ میں کوئی سقم ہے۔ میں استانی صاحبہ پر شبہ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ انہوں نے بھی کہیں پڑھ پڑھا کر ہی لکھا ہوگا جو صحیح ہے۔ حالانکہ صحیح لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری نہیں۔ جس طرح پڑھ پڑھا کر غلط لکھا جاسکتا ہے اسی طرح بغیر پڑھے کے صحیح بھی لکھا جاسکتا ہے گو بعض ایسے بھی ہیں کہ پڑھنے کے بعد نہ تو صحیح لکھ سکتے ہیں اور نہ غلط البتہ یہ درست ہے کہ بغیر پڑھے نہ تو صحیح لکھ سکتے ہیں نہ غلط۔ غلط یا صحیح لکھنے کے لئے پڑھنا ضروری ہے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے لکھ چکی یا اگر نہیں لکھا ہے تو اب لکھ رہی ہوں کہ یہ بھی لازمی نہیں کہ "جو آپ پڑھیں وہی لکھیں یا جو آپ نے لکھا ہے وہ آپ پڑھ چکے ہوں" اس کی دو مختلف قسم کی مثالیں ہوسکتی ہیں ایک تو خود اسیری دوسرے گاندھی جی کی ——— مثال دینے سے پہلے میں اس نکتہ کو واضح کردینا چاہتی ہوں کہ میری اور گاندھی جی کی مثال پر آپ ہنستے ہیں کیونکہ میں گاندھی جی کو "عالم پاک" تسلیم کرسکتی ہوں خود کو خاکی سمجھ سکتی ہوں۔ خود کو خاک تصور کرنے میں مجھے قطعی کوئی عار نہیں۔

ہاں تو پہلی مثال یہ ہے کہ میں جو لکھتی ہوں وہ پڑھتی نہیں۔ اگر لکھنے کے بعد ایک آدھ مرتبہ پڑھ لوں یا غور

ہی ہیں کچھ پڑھ پڑھا کر لکھوں تو ادبی نگاروں کو قلم چلانے کی ضرورت نہ پڑے بعض وقت مجھے اہل قلم پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اس کے باوجود مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ مجھے کبھی کبھار اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ میں جو لکھتی ہوں وہ کوئی اور بھی پڑھتا ہوگا یا نہیں؟ میرا ذاتی جواب یہ ہے کہ یقیناً پڑھتے ہوں گے۔ یہی ایک حل طلب نکتہ رہ جاتا ہے کہ وہ مضمون کی اچھائی یا برائی بتانے کے لئے خط کیوں نہیں لکھتے؟ میرا یہ خوشگوار تصور بہت زیادہ خود ستائی تو نہیں کہ میرے مضامین پڑھ کر ہی تو اکثر رسالوں کے ایڈیٹر مجھے مضمون لکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور عنایت نامے لکھتے ہیں۔

آپ بغیر ہنسے سنجیدگی سے گاندھی کی مثال پر غور کیجئے۔ ہنسنے اور سنجیدہ رہنے میں بہت بڑا فرق ذرا غور کرنے پر ہے۔ اگر ادبی نگار صاحب نے اصلاح نہیں دی ہے تو آپ کو پچھلی سطروں میں ایک جملہ ملا ہوگا جس کا مطلب تھا ——— "تھا" کیوں کہوں "ہے" کہنا چاہیئے کیونکہ اس جملہ کو جب پڑھا جائے گا تو وہی مطلب نکلے گا جو اس میں ہے یعنی ——— "یہ بھی لازمی نہیں کہ جواب پڑھیں وہی لکھیں یا جواب نے لکھا ہے وہ آپ پڑھ چکے ہوں" گاندھی جی نے بیرسٹری پڑھی مگر راجکوٹ کے متعلق اتنا لکھا کہ طبیعت گھبرا گئی۔ بیرسٹری کا نصاب پڑھنے اس میں راجکوٹ کے متعلق کچھ بھی لکھا ہوگا۔ جہاں راجکوٹ کے متعلق لکھا ہوگا وہاں بیرسٹری کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ گاندھی جی کے ساتھ راجکوٹ اور راجکوٹ کے ساتھ گاندھی جی کا کچھ حال لکھا جائے۔ الفاظ کے اس الٹ پھیر میں کبھی یہ مغالطہ نہ ہوجائے کہ گاندھی جی راجکوٹ ہوگئے یا راجکوٹ کی ریاست گاندھی جی بن گئی۔ کیونکہ کوٹ کے ساتھ ٹوپی کا اور زیادہ تر گاندھی ٹوپی کا خیال آتا ہے اس لئے یہ واضح کردینا مناسب ہوگا۔ کہ گاندھی جی اور راجکوٹ دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک آدمی ہیں اور دوسری ریاست۔ اب یہ بات اور ہے کہ جس طرح ٹوپی کو گاندھی جی سے نسبت ہوگئی اسی طرح راجکوٹ کا تعلق بھی گاندھی جی سے کچھ ہوگیا ہے حالانکہ راجکوٹ گاندھی جی اور ٹوپی میں وابستہ کوئی رشتہ نہیں۔

میں نے اتنا بہت سا لکھ مارا۔ آپ نے بڑی مشکل سے سب پڑھا ہوگا، اور گھبرا گئے ہوں گے اس لئے ختم کردینا چاہیئے اگر آپ گھبراتے نہیں ہیں تو اس مضمون کو پھر ایک مرتبہ پڑھیئے اس کے بعد دیکھئے کہ گھبراہٹ شروع ہوتی ہے یا نہیں اگر نہ گھبرائیں تو واقعی میں اپنے لکھنے اور آپ کے پڑھنے کی داد دوں گی کیونکہ اب میں خود گھبرا گئی ہوں۔ آداب عرض ہے فقط

شکیلہ جی۔ یم خاں

دنیا

کنول پرشاد جیسوال کنولؔ

حق کی علمبردار ہے دنیا
سچ کی دعوادار ہے دنیا

پر یہ حقیقت کس سے چھپی ہے
ہر فن ہے مکار ہے دنیا

اندھوں کی سرکار ہے یارو
جھوٹوں کا دربار ہے دنیا

جتنا سستا چاہو خریدو
پاپوں کا بازار ہے دنیا

گرنے پہ ہے نکلنا مشکل
ایک اندھیر اغار ہے دنیا

زد میں جو آئے پھر نہ اُٹھے
دو دھاری تلوار ہے دنیا

بے شرمی گھلتی میں پڑی ہے
کتنی پانی دار ہے دنیا

چین نہیں دنیا والوں کو
سرتاپا آزار ہے دنیا

جلنا جلانا کام ہے اس کا
دوزخ کی انگار ہی دنیا

چوس لے خوں تک کمزوروں کا
وہ ظالم خونخوار ہے دنیا

پھلنے کے ڈھنگ بھول الٰہم

تباہی سے بچا رہی دنیا

جمیل میرا دوست تھا، ہائی اسکول اور کالج میں ہم نے زندگی کی کئی بہاریں۔ سردیاں۔ گرمیاں۔ اور برساتیں ساتھ گذاری تھیں۔ وہ بڑا ہنس مکھ زندہ دل اور خوش مزاج تھا اس کے ملاقاتی اتنے کثیر تھے کہ بعض اوقات گھبرا کر "مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ" کہہ اٹھتا تھا۔ عجب بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کوئی توقع نہ رکھتا۔ سوا خلوص اور محبت کے جسے قدرت نے اس کی طینت میں سب سے زیادہ ودیعت کیا تھا۔ وہ حسن پرست تھا اور طبعاً شاعر لیکن لکھتا بہت کم اگرچہ اس کی گفتگو میں شعریت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مصوری سے اس کو دلچسپی تھی اور کہتا تھا۔ کہ ایک مصور۔ اور شاعر اور افسانہ نگار میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ مصور الفاظ سے کام نہیں لیتا۔ لیکن اس کے خطوط اور رنگ آمیزی۔ صناعی۔ شاعری اور افسانہ نگاری کا کام کرتے ہیں۔ ——————— اور یہ تصویر بجائے خود ایک مکمل افسانہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تصویریں بناتا بھی تھا۔ لیکن محض تفنن طبع کے لئے۔ چنانچہ تصویر ختم ہونے کے دوسرے روز ہی عموماً اس کے پرزے ردی کی ٹوکری میں نظر آتے۔ اور وہ خود ایک نئی تصویر بنانے میں مصروف ہو جاتا جو بعض اوقات مہینوں تکمیل کے زینے طے کرتی رہتی اور آخر کار اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس سے پہلے کے نقوش کا ہو چکا تھا۔

اس کی نظموں سے ایک عجیب امنگ جوش اور بیتابی کا اظہار ہوتا، اور جس وقت وہ ہارمونیم پر اپنی کوئی غزل احباب کو سناتا تو شمیم اور حمید ایسے بدذوق بھی خاموش بیٹھے رہتے اور کچھ نہ کچھ تاثیرات لیکر اٹھتے۔ اس دورِ زندگی میں میں نے مشکل سے کبھی اُن ہیں غمگین۔ خاموش یا پریشان دیکھا۔ قدرت نے اسے ایک حساس دل دیا تھا۔ لیکن وہ بہت کم اپنے احساسات کا اظہار کسی کے سامنے کرتا۔ چنانچہ اس کے دو تین دوست ہی اس کی سیرت کے اس پہلو سے واقف تھے۔

فروری کا مہینہ تھا، جمیل نے مجھ سے کہا، چلو چند روز کے لئے سلیم پور ہو آئیں۔ میں بھی شہر کی ہنگامہ پرور زندگی سے اکتا سا گیا ——— اور تھوڑی سی تبدیلی کا خواہاں تھا۔ شام کو یہ گفتگو ہوئی اور صبح کو ہم لوگ سلیم پور روانہ ہو گئے۔ چند گھنٹے کا راستہ تھا۔ خواب وخیال۔ اور لالہ رخ پڑھنے اور باتیں کرنے میں گذر گیا۔ اور ہم سلیم پور پہنچ گئے۔

یہ مقام ایک چھوٹا سا قصبہ احد جمیل کا ننہال ہے۔ کہا جاتا ہے کسی زمانے میں یہاں کثیر آبادی تھی۔ اور بڑے بڑے شریف خاندان آباد تھے۔ لیکن اب تو یہاں قدیم مقبرے نظر آتے ہیں، یا شکستہ محلات۔ مسجدیں کثرت سے ہیں۔ اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لیکن سنسان۔ اور نمازیوں کے بجائے کبوتروں اور چمگادڑوں کا مسکن۔ مشہور ہے کہ بعض میں جنوں نے اپنا ڈیرہ جما یا ہے۔ ایک مسجد جو کالی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ ہم دونوں اس کی وضع۔ ساخت اور ماتمی رنگ سے متاثر ہو کر اسے دیکھنے گئے۔ مسجد کو اسی قصبہ کے ایک رئیس نے دو ڈھائی سو برس پہلے بنایا تھا۔ آج بھی اُن کا نام زندہ ہے اور کالی مسجد کے علاوہ جنوں کی مسجد اور سیاہ پوش کی مسجد کے پتے سے قرب و نواح میں رہنے والوں کے خطوط آتے ہیں۔ یہاں ایک عمر رسیدہ حکیم سے ملاقات ہوئی جنھیں قصبے کے بوڑھے اور بچے نانا کہتے تھے۔ انہوں نے پچاس سال قبل یہاں شادی کی تھی۔ اور سسرال ہی میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی۔ سیاہ پوش کے متعلق دریافت کرنے پر کہا کہ اُنہوں نے اپنے بزرگوں سے جو قریب کے قصبے نسیم پور میں رہتے تھے، سُنا ہے کہ تقریباً دو سو سال پہلے شاہی فوج کے دو سردار نسیم الدین اور سلیم الدین نامی تھے، اون کے والد نے یہ دونوں قصبے اپنے بیٹوں کے نام پر آباد کئے تھے۔ نسیم کو اپنی چچیری بہن رفیعہ سے بہت محبت تھی خوش قسمتی سے ان دونوں کی شادی بھی ہو گئی لیکن چند ہی سال بعد وبا آئی۔ اور نسیم کے کئی عزیز اس کی نذر ہو گئے ان میں رفیعہ بھی شامل تھی۔ نسیم کو سکتہ سا ہو گیا۔ اور کئی روز تک دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ ایک روز کچھ ہوش میں تھے ایک لڑکے سے پوچھا کہ رفیعہ کہاں دفن ہے اُس نے اس مقام کا پتہ بتایا جہاں آپ مسجد دیکھ رہے ہیں۔ اور جس کے شمالی گوشے میں رفیعہ اور نسیم ابدی نیند سو رہے ہیں۔ نسیم قبر پر جا کر دیر تک فاتحہ پڑھتے رہے۔ اور یکایک رونا شروع کیا۔ لڑکے نے گھبرا کر ان کے بھائی کو اطلاع دی۔ اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ لیکن نسیم کسی دوسری دنیا میں تھے۔ روتے روتے بیہوش ہو گئے تو لوگ اُٹھا کر گھر لے گئے۔ اس زمانے میں یہاں ایک نامی حکیم مسیح الزماں محمد اسحاق رہتے تھے۔ جن کا شکستہ مقبرہ آپ نے راستے میں دیکھا ہو گا۔ اون کے علاج سے نسیم اچھے تو ہو گئے۔ لیکن ہر وقت کھوئے ہوئے سے رہتے۔

ایک روز لوگوں نے اونہیں سرتاپا سیاہ لباس میں دیکھا۔ اونہوں نے بھائی سے مشورہ کر کے اپنی ساری جائداد اونہیں کے ہاتھ فروخت کر دی اور سیاہ پتھر کی مسجد بنوانی شروع کی۔ اسے بننے میں چھ مہینے کی مدت صرف ہوئی۔ لیکن اس بندۂ خدا کو کسی نے اس عرصے میں ہنستے بلکہ مسکراتے بھی نہ دیکھا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ خود بھی پتھر ڈھوتے اور عام مزدوروں سے زیادہ تندہی اور جانفشانی سے اس طرح کام کرتے۔ گویا اسی کام کے لئے زندہ ہیں۔ اور ہوا بھی ایسا ہی مسجد بن کر تیار ہو گئی۔ مغرب کا وقت تھا اہل قصبہ بچے بوڑھے

سب جمع تھے۔ نماز کے بعد مٹھائی جو تقسیم ہونے والی تھی۔ آس پاس کے گھروں کی ہندو عورتیں بچوں کو پھونک ڈلوانے کے لیے مسجد کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ نسیم دیگر نمازیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ لیکن خاموش موذن نے اذان دینا شروع کی۔ جس وقت لا الہ پر پہنچا تو تبسم کی زبان سے الحمدللہ نکلا۔ اور وہ گر کر بیہوش ہو گئے۔ حکیم نے نبض دیکھی تو روح پرواز کر چکی تھی، ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔ اور بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مشہور رہے کہ اس مسجد میں جن رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی لوگوں کو لاالہ الااللہ اور الحمدللہ کی آوازیں آتی ہیں بعض لوگوں نے تو ایک سیاہ پوش کو شمالی کونے سے مسجد کے اندر جاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

ہم دونوں یہ المناک افسانہ محبت سن کر مسجد کے اندر گئے۔ دیواروں پر متعدد عرضیاں شہنشاہ جن کے نام لکھی ہوئی تھیں۔ جن میں ہر قسم کی استدعائیں خصوصاً حصولِ اولاد اور روزگار کے متعلق درج تھیں۔ بعض میں نذر و نیاز کے وعدے تھے اور بعض میں التجائیں۔

ہم نے ایک ہفتہ بیر وٹسکار میں گذارا۔ دھانوں کی فصل جواں تھی۔ اور ہمارا محبوب مشغلہ وہاں ہوا کھانا تھا۔ یا ایک بلند چٹان پر بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے آفتاب کے بوقلموں مناظر دیکھنا۔ لیکن چار پانچ روز بعد میں نے محسوس کیا کہ جمیل کچھ خاموش سا رہنے لگا ہے اور بہت کم بات کرتا ہے بلکہ بعض اوقات سیر کے لئے تنہا جانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ایک مرتبہ میں نے صبح کو اسے بستر سے غائب پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ندی کنارے طلوع مہر کے مناظر دیکھنے گیا ہے۔

ہم جلدی کالج واپس آ گئے۔ مگر جمیل میں روز بروز نمایاں اور محسوس تغیر معلوم ہونے لگا۔ پہلے وہ مہینہ دو مہینہ میں اپنی ڈائری لکھتا۔ لیکن اب روزانہ دو چار فقرے ہی سہی لیکن لکھتا ضرور۔ میں نے اس کی بے چینی اور پریشان خاطری کو محسوس کر کے اشارۃً و کنایۃً دریافت کرنا چاہا۔ لیکن اس نے ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹالدیا۔ اس کی حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔ اور وہ زیادہ تر وقت غور و فکر۔ خاموشی اور تنہائی میں گذارنے لگا۔ امتحان قریب تھا۔ اور وہ کالج اور تعلیم سے بے پرواہ نظر آتا تھا ایک روز میں نے اس سے پوچھ لیا کہ آخر اس حالت کا سبب کیا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے صرف یہ کہا کہ کسی وقت فرصت سے میری ڈائری دیکھ لینا۔ یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔ میں اس کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ اس لئے میں نے اس کی ڈائری نکالی اور ان تاریخوں پر نظر ڈالی جو ہم نے سلیم پور میں گذاری تھیں اس نے لکھا تھا۔

۶ ہر فروری ۳۶ء آہ نوشابہ! میری زندگی! میری روح! میری دولت! کاش تو میری ہوتی!

میں نے ورق اُلٹا تو اگلی تحریروں پر نظر پڑی

۸ ہر فروری ۳۶ء۔ ہاں میں تیرے لائق نہیں! تیری صورت اور تیری قابلیت کے شایاں نہیں کہ مجھ

ایسے شخص سے اپنی زندگی وابستہ کرے "

۹ر فروری سنہ ۳۶ء مجھے آخر اس سے کیوں اتنی محبت ہے ۔ مجھے اس سے محبت کرنے کا حق ہی کیا ہے۔ آج میں ایک افسانہ پڑھ رہا تھا ۔ اُس کا نام آگیا ۔ میں نے اسے ہونٹوں سے کیوں لگایا۔ اس میں کیا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

۱۰ر فروری سنہ ۳۶ء سعید مجھ کو بے مروت سمجھتا ہوگا ۔ میں دو روز سے صبح کو اکیلا سیر کو چلا جاتا ہوں وہ میرا دوست ہے میں اس سے سب کچھ کہدوں گا ۔

۱۱ر فروری سنہ ۱۹۳۶ء کیا وہ مجھ سے محبت کرے گی ؟ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ سوا ایک چیز کے ۔ مگر اُس کی قدر ہی کیسے اور ہے بھی کِس کام کی ۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور محبت کے سوا میرے پاس کوئی چیز نہیں جسے پیش کر سکوں "

۱۳ر فروری سنہ ۳۶ء ۔ ہے یہی فرط وفاداری کہ بے چون وچرا وہ مجھے چاہیں نہ چاہیں ، میں انہیں چاہا کروں۔

۱۴ر " " ۔ آخر پھر کالج آگیا ۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔ لیکن اُس کی ایک نظر عنایت مجھے کیمیا ساز بنا سکتی ہے۔ میں اُس کے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں ۔ سب کچھ ہو سکتا ہوں اور سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں ۔ اوس کی ایک ہاں پر ساری دنیا اپنے قبضے میں لا سکتا ہوں ۔ آج ماموں جان کا خط آیا ہے وہ سب کو لے کر بمبئی جا رہے ہیں مجھ سے کہتے ہیں کہ میں بھی امتحان کے بعد اون کے پاس بمبئی چلا آؤں اور اون کے کاروبار میں مدد دوں ۔

۱۵ر فروری سنہ ۱۹۳۶ء سعید جیسے میری نگرانی کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں میرا دوست ہے ۔ میری بھی کتنی زیادتی ہے میں اُس سے کس قدر روکھے پن سے مل رہا ہوں ۔ خیر میں کوشش کروں گا ۔ کہ آئے شکایت کا موقع نہ ملے ۔ ماموں جان نے کتنی محبت سے بمبئی بلایا ہے ۔

یہ تھے چند فقرے جو میں نے اس وقت دیکھے اور اس وقت اس کے روزنامچہ سے نقل کر رہا ہوں ۔ اتفاق سے اسی زمانے میں میرے ایک عزیز بیمار ہو گئے اور میں اورنگ آباد چلا گیا ۔ واپسی پر میں نے اس کی محبت میں کوئی کمی تو نہ پائی ۔ لیکن وارفتگی اور اضطراب میں البتہ اضافہ ہو گیا تھا ۔

امتحان ختم ہو گیا اور ہم دو تین روز بعد بمبئی روانہ ہو گئے ۔ جمیل کے ماموں ، شمیم الحسن صاحب بمبئی کے ایک بڑے تاجر تھے ۔ ساحل سمندر پر ایک وسیع و دلکش مکان تھا ۔ ان کی لڑکی نوشابہ ایک نہایت شریر و ذہین بیحد جمیل تھی ۔ اس کے والد نے اس کی تعلیم پر خاص توجہ کی تھی ۔ فارسی وہ اہل زبان کی طرح بولتی تھی ۔ اردو کا مطالعہ وسیع تھا ۔ انگریزی مطالعہ زیادہ وسیع نہ تھا لیکن اپنے مافی الضمیر کو بخوبی ادا کر سکتی تھی ۔ اس کے والد پردے کے مخالف تھے ۔ اور وہ بلا تکلف اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں جمیل پر ایک وارفتگی سی طاری ہو جاتی ہے ۔ نوشابہ کبھی کبھی اس کی وارفتگی پر فقرے کستی لیکن جمیل خاموشی سے مسکرا دیتا ۔

اور زیادہ سے زیادہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا۔

اسی دوران میں ایک روز اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ شمیم الحسن صاحب کے دوست حمید الدین صاحب نے جو ہمیر پور کے رہنے والے تھے۔ اور بمبئی میں ایک بڑے تاجر تھے۔ اپنے بیٹے عزیز کا پیغام نوشابہ کے لئے بھیجا ہے۔ عزیز اکثر ہمارے ہاں آتا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان اور جامعہ بمبئی کا گریجویٹ تھا۔ اس کے پاس حسن اور دولت دونوں چیزیں تھیں۔ اور کوئی وجہ نہ تھی کہ نوشابہ اسے اپنا بنانا منظور نہ کرتی۔ لیکن اس نے ابھی تک اپنی زبان سے کچھ نہ کہا تھا۔ اور معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکی ہے۔ اب وہ نسبتاً خاموش رہتی۔ اس کی بذلہ سنجیوں اور شوخیوں میں کمی آ چکی تھی اس زمانے میں ایک روز میں نے خلاف معمول جمیل کو بہت غمگین اور افسردہ پایا۔ تو اس کی ڈائری دیکھی لکھا تھا۔

۲۴ اپریل ۳۰ء خاک ہوں گو جگر و دل مگر اے ضبطِ فغاں
دیکھنا آتشِ خس پوش سے اٹھے نہ دھواں

۲۵ اپریل ۳۰ء جی چاہتا ہے کہ کہیں چلا جاؤں۔ غالباً اسے عزیز سے محبت ہے۔ لیکن مجھ سے چھپاتی ہے کئی روز سے خاموش ہے۔ میں بھی کتنا خود غرض ہوں۔ اپنی مسرت کے لیئے اسے غمگین بنا رہا ہے بہار کی تیتری سے اس کا رنگ اور سیماب وشی چھین لی۔ بلبل کے نغمہ پر پابندیاں عاید کر دیں۔ اور نسیم سحر سے خنکی چھین لی ہے۔ مجھے کہیں چلا جانا چاہیئے۔

۲۶ اپریل ۳۰ء۔ کیا اسے عزیز سے بھی محبت نہیں۔ آج کا برتاؤ کچھ عجیب و غریب تھا۔

۲۷ اپریل ۳۰ء۔ آج اسے میں نے یہ خط لکھا۔

عزیزہ نوشابہ!

میری پر مسرت زندگی ایک خواب ہو گئی ہے۔ میں نے ایک نئی دنیا آباد کرنی ہے۔ تم کو بھی کئی دن سے غمگین اور افسردہ دیکھ رہا ہوں۔ پرسوں ہم لوگ سیر کرنے گئے تھے۔ وہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی چٹان تو یاد ہوگی جہاں تمہاری فرمائش پر میں نے ہارمونیم بجایا تھا۔ جسے سن کر تم نے کہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ہارمونیم میں کوئی غمگین روح سما گئی ہے۔ ان ناکام محبت روحوں میں سے جو آغوش بحر میں آسودہ خواب ہیں۔ مجھے اس چٹان میں ایک عجیب کشش معلوم ہوتی ہے۔ چاندنی راتیں بھی ہیں۔ اگر خلاف مرضی نہ ہو تو کل شام کو اس مقام پر چلو۔ میں تم کو ایک نئی غزل سناؤں گا۔ جو میں نے کل شب میں لکھی تھی۔ امید کہ تم مایوس نہ کرو گی۔

اس کے نیچے لکھا تھا۔ میری التجا قبول ہو گئی۔ اور

خبرم رسیدہ امشب کہ نگار خواہی آمد"

میں اس کی حالت دیکھ کر سخت پریشان تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا کہ پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی کروں۔
شام کے پانچ بجے تھے۔ میں ایک دوست سے ملاقات کا بہانہ کرکے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ وہ آیا لیکن کھویا ہوا۔ اور مضطرب سمندر کی موجوں کی طرح۔ وہ دیر تک کھڑا سمندر کی موجوں کو دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا' وہ انہیں گننے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر سمندر میں پھینکنے شروع کئے۔ اس انہماک سے گویا سمندر پاٹ دینے کا ارادہ کرلیا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے پتھر پھینکنے بند کر دیئے اور گنگنانا شروع کر دیا اور کہنی پر سر ٹیک کر کروٹ سے لیٹ گیا۔ اب وہ خاموش تھا' اور کسی گہرے خیال میں مستغرق۔ میں اس سے تقریباً پندرہ بیس گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی کے پیچھے کھڑا ہوا اس کے حرکات و سکنات کا معائنہ کر رہا تھا' یکایک وہ اٹھا۔ جنگلی جھاڑیوں پر خودرو بیلیں پھیلی ہوئی تھیں اس نے بہت سی کلیاں توڑیں۔ ایک خوبصورت گلدستہ بنایا اور اپنے قریب رکھ لیا۔ اس کے بعد چند بڑے بڑے پتوں پر جیب سے قلم نکال کر کچھ لکھا۔ اور جھاڑیوں کے سایہ میں لیٹ رہا۔

تھوڑی دیر گذری۔ وہ غالباً سو رہا تھا۔ یکایک مجھے ایک ہوٹر آنے کی آواز معلوم ہوئی اور ذرا دیر بعد ایک جانب چند جھاڑیاں ہلتی ہوئی نظر آئیں۔ نوشابہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چٹان کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے دور سے جمیل کو دیکھا۔ تیزی سے بڑھی اور قریب پہنچ کر آہستہ سے پکارا جواب نہ ملنے پر قریب پہنچی کوئی چیز جھک کر اٹھائی مسکرائی اور جمیل پر جھکی۔ یکایک فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھا وہ گر پڑی تھی۔ میں پریشان ہو کر چٹانوں سے بچتا۔ جھاڑیوں کو ہٹاتا قریب پہنچا۔

ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا سانپ بھاگتا ہوا جھاڑی میں چھپ گیا۔

دونوں خاموش پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہونٹ نیلے ہو گئے تھے۔ گلدستہ قریب ہی پڑا تھا لیکن کلیاں پھول بن گئیں تھیں۔

مسلم ضیائی ایم۔ اے
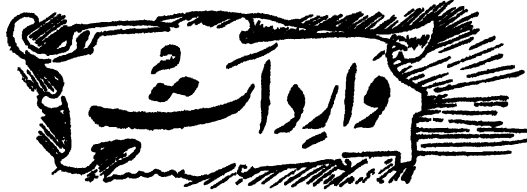
حضرت کاوشؔ۔ حیدرآبادی

کیا فرشتوں کی زباں پر بھی ترا نام نہ تھا

کیوں مجھے خلق کیا مجھ سے اگر کام تھا

میں ہی اس عہد میں تھا خونِ تمنا کیلئے !

موسمِ گل میں کوئی اور نہ دام نہ تھا

اُف، یہ گھڑیاں کہ ترا درد ہے عنوانِ سکون !

ہائے وہ دن کہ ترے درد میں آرام نہ تھا

بات کیا ہے کہ دگرگوں ہے جہاں کا انداز

تیرا جلوہ تو کسی رنگ میں بھی عام نہ تھا

آپ کو دردِ محبت کا یقین کیوں آئے

وہ تو کاوشؔ کی غزل تھی کوئی الہام نہ تھا

اس مقالے میں "اتاترک" کے اخلاق و کردار اور بالخصوص ان کی شرربار تقریروں کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ ناظرین کو ان تقریروں سے "اتاترک کی قوتِ گویائی اور طرز بیان کا اندازہ ہوسکے۔ طوالت کے خوف سے اس مضمون کو اس موضوع کا اجمالی خاکہ سمجھنا چاہیئے۔

جہاں تاریخ عثمانیہ سلیمان اعظم ——————— محمد اول اور مراد ثانی کے ان مٹ کارناموں سے جگمگا رہی ہے وہاں دنیا کا کوئی مورخ "جدید جمہوریہ ترکی" پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس اولوالعزم انسان کے کارناموں کو فراموش نہیں کرسکتا، جس نے ترکی کے آثار کو از سرِ نو زندہ کرنے اور ترکی کے مقام کو بلند و برتر بنانے میں وہ محیر العقول جد و جہد کی، جس جد و جہد کی تابناکی کے سامنے دنیا کے نامور آمروں پلڈوسکی، ڈی ویلرا، لینن، اسٹالن اور مسولینی کے کارنامے ماند پڑ جاتے ہیں۔ غازیٔ اعظم کی زندگی میں ترکی کا کوئی اجتماع، کوئی سوسائٹی اور کوئی سماجی، معاشی یا تمدنی مجلس ایسی نہ تھی جس میں ان کا نمایاں اثر نظر نہ آتا ہو۔ "بطلِ جلیل" کے اقتدار اور شخصیت کو جس وصف نے اجاگر کیا وہ وصف ان کا آہنی عزم و استقلال تھا انہوں نے سیاست کے قیامت خیز طوفان میں قوم کی سفینۂ حیات کی نہایت پامردی اور مقودات کے ساتھ ناخدائی کی ہے۔ ابتداہی سے وہ موجودہ . . . حکومت سے سخت متنفر تھے اور ابھی وہ نوجوانوں ہی کی صف میں تھے کہ ان کے دل میں —— حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔

موصوف میں جو سپاہیانہ روح تھی وہ انہیں ان کے اسلاف سے ورثہ میں ملی تھی اور آپ نے طالب علمی کے زمانے میں یہ حلف اٹھایا تھا کہ اس کی . . حکومت سے قوم کو کبھی نہ کبھی نجات دلاؤں گا۔ یہ سن کر مدرسے کے ساتھی آپ کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن دوستوں کی پھبتیاں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکیں اور بالآخر غازی نے اپنے بل بوتے پر ایک باغیانہ قلمی اخبار کالج سے نکالنا شروع کیا۔ فدایان وطن کے سامنے مصطفےٰ نے خود ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ "میں بارہ برس کی عمر سے اپنے وطن کی شان و شوکت کو بلند کرنے کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوں اور اس معاملہ میں میں نے مطلق تغافل اور تساہل نہیں کیا۔"

اگرچہ کہ "بطلِ جلیل" دنیا کی ممتاز ترین شخصیت اور کروڑہا ترکوں کے شفیق باپ مانے جاتے تھے لیکن وہ ہمیشہ نمود و نمائش، غرور و تکبر اور دنیاوی حرص و طمع سے دور رہے انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات لطیفہ خانم کو صرف اس لیے طلاق دی کہ جا و بے جا اس نے ان کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی شروع کی تھی۔ آپ نے اپنی محبوبہ لطیفہ خانم کے

بارہا اسرار کے باوجود قوم کی فلاح کے آگے محبت کو ترجیح نہ دی اور اسی حقیقت کا انکشاف کیا کہ عشق و محبت کے ہزار دیوتا ترکوں کے باپ کو اس کے منصوبوں سے ہٹا نہیں سکتے۔ وقت کی پابندی، صفائی اور ہر روز غسل، فوجوں کا بلاناغہ معائنہ، اور قوم کے یتیم بچوں کی دیکھ بھال ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ آپ نے عنانِ جمہور سنبھالتے ہوئے اپنے آئندہ خوابوں کی تعبیر یوں بیان کی کہ "دور اندیش سپہ سالار کو دور اندیش قانون ساز بھی ہونا چاہیئے اور اس کی تصدیق اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ ثابت کر دے کہ اپنی جانباز قوم کو صلح جو اور امن پسند بنا سکتا ہے"۔ اسی عقیدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس "مدبر اعظم" نے ایک ایسی کابینہ کی تشکیل کی جو ملک کے اعلیٰ ترین دماغوں اور ایثار نفس شخصیتوں پر مشتمل تھی۔ ان کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی کہ وہ بہت جلد پیچیدہ معاملات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی کو ایکبار دیکھ لیتے پھر تیس تیس برس تک اُسے نہ بھولتے تھے۔ آپ نے اپنے بدخواہوں کو ہمیشہ معاف کیا لیکن وہ جنہوں نے قوم کی بدخواہی یا قوم سے غداری کی وہ بلا پس و پیش موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ علم التاریخ میں موصوف کے معلومات نہایت وسیع تھے چنانچہ غازی عہد ماضی کی عبرتوں سے موجودہ حکومت کی اصلاحات میں فائدہ اٹھاتے تھے۔ ایک فرانسیسی L.-B.-MAIN" جس نے اتاترک سے ملاقات کی تھی لکھتا ہے کہ۔ "اگر تم پبلک مقامات پر مصطفیٰ سے ملو تو وہ ایک مہذب فرانسیسی ہے جس کی زبان نہایت سُرعت کے ساتھ معلومات کا ایک انبار لگا دیتی ہے۔ تم اور غور سے دیکھو تو میں سمجھتا ہوں کہ تم غازی موصوف کو ہر تنقید سے بالاتر پاؤ گے اور اگر تم غازی اعظم سے ان کے مکان پر ملو تو ان کی ہر شئے میں مشرقی تاجداروں کی جھلک نظر آئے گی۔

فن تقریر کے نقطۂ نگاہ سے اتاترک اپنے وقت کے "پیرک لیز" اور ابی غسان تھے، وہ اپنی ثمربار تقریروں میں درد و کرب، منظر کشی اور عبرت کے اجزا کو کچھ اس طرح سمویا کرتے تھے کہ سامعین پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور لاکھوں ترک اپنا کلیجہ تھام تھام لیتے تھے۔ ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کے دن جو تقریر اُنھوں نے "سام سون" کے مجمع عام میں کی تھی، یہ تقریر ترکوں کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ شعلہ بیانی کا یہ عالم تھا کہ دورانِ تقریر میں جب اتاترک نے قوم سے قربانیوں کی بھیک مانگی اسی وقت ہزاروں ترک اپنے سر پر کفن باندھ کر وطن کی قربان گاہ پر جمع ہو رہے تھے۔ ترک مائیں اپنے لخت ہائے جگر کو اپنے "نجات دہندہ" کے قدموں پر ڈال رہی تھیں اور بچہ بچہ کمال کی دلخراش آواز سن کر مرنے اور مارنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ درحقیقت "انقلاب ترکی" (۱۹۲۱ء) میں جو جذبۂ جاں سپاری از سرنو ترک قوم میں پیدا ہوا، اس کا پہلا سبب مصطفیٰ کمال کی وہ شعلہ بار اور عبرت انگیز تقریریں تھیں، جنہوں نے ترک قوم میں نئی زندگی، نئی حسرت، نئے ارمان اور نئی اُمنگ پیدا کی۔ اس تاریخی تقریر کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"۔ تم جانتے ہو کہ لائیڈ جارج نے یونانی داناؤں کو ہم ترکوں کے خلاف پروانۂ قتل و غارتگری دیدیا ہے!۔۔۔ لاکھوں یونانیوں نے دول یورپ کی سنگینوں کے بل بوتے پر جو مظالم ہم پر ڈھائے ہیں ان مظالم کے گہرے اثرات ہمارے

قلوب پر مرتسم ہیں..... تمہارے کان ان معصوم روحوں کی چیخ و پکار کو سن رہے ہیں جو نیزوں کی انیوں پر اچھالے گئے!! تم نے سمرنا کی اس حسین آبادی کو بھی دیکھا ہے؟ اب دیکھو! آج وہی حسین سمرنا آگ کے بھیانک شعلوں کی لپیٹ میں کراہ رہا ہے...... ترک ماؤں اور بہنوں کو دیکھو جو وطن کی قربان گاہ پر اپنا دم توڑ رہی ہیں بچوں نے اپنی ماؤں کے اور بہنوں نے اپنے بھائیوں کے نرم و نازک سینوں کو سنگینوں سے پیوست دیکھا.. ضعیف ترکوں کے سینوں پر پتھر کی بڑی بڑی سلیں رکھ کر انہیں تڑپایا گیا۔ ماؤں کے روبرو ان کے دودھ پیتے بچوں کے جگر چبائے گئے اور حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑے گئے۔ اب سمرنا کا بول بالا ہو چکا ہے یونانی دالوسے اب یہیں کے کسانوں کو اپنے ظلم و تعدی کا تختہ مشق بنا رہے ہیں..... ان مظلوموں کی تڑپ اور سسک کو دیکھ کر زمین لرز رہی ہے۔ موت کی چیخوں کو سن سن کر آسمان کانپ رہا ہے لیکن اُف اے بدبختی کہ تم ———— نے چپ سادھ لی اور اس قتل عام کا تماشہ دیکھ رہے ہو۔ اور ادھر تمہارا جمود اور تعطل تمہاری موت کے سامان مہیا کر رہا ہے تمہاری سہل نگاری آرام طلبی اور عافیت کوشی کو دیکھ دیکھ کر سلیمان اعظم کی روح قبر کے گوشوں میں مضطرب اور بے چین ہوگی..... عاقبت نا اندیش حکومت اس کے بوڑھے عمائدین ———— ان کے محلات کی چھتوں کے سنگ مرمر بے حس و حرکت روح کے آئینہ دار ہیں۔ عالموں مفتیوں اور مولویوں کا گروہ عظیم بلا سوچے سمجھے قتل و غارتگری کے ناپاک فتوے فدایان وطن کے سر تھوپ رہا ہے جنہوں نے سمرنا کے قتل عام پر دبی ہوئی آواز میں خلیفہ اور اس کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ خلیفہ اور علماء کا مذہب تو اسلام ہے لیکن ان سب کے کام غیر اسلامی ہیں۔ بیت المال کی بے شمار دولت غیر ملکی غداروں کی تبلیغی مسیحی مشنریوں کے لئے وقف ہو چکی ہے اور پادری اس دولت کے بل بوتے پر ترکوں کو عیسائیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ اُن کا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اگر تم وطن کی عزت، حرمت اور ناموس کی خاطر اپنے خون کو ارزاں کر دو! ان کا یہ خواب خواب رہے گا اگر تم فنا اور قربانیوں کے طلسم کو سمجھ لو۔ جس طرح میں سامسون میں بازنطانی حکومت کے کھنڈرات پر کھڑا ہوں اور تمہارے کانوں میں آزادی کی تلخ شراب ڈال رہا ہوں یاد رکھو کہ اگر اس تلخ شراب کے اثرات تم پر تمہارے قلوب پر اثر انداز نہ ہو سکے تو یونانی پھر انہیں کھنڈرات پر ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھیں گے۔ تاریخ تمہیں ملعون کہے گی کہ وہ سلطنت جس کی جڑوں کو ہمارے اسلاف نے کامل چھ سو برس تک اپنا خون پلایا ہے وہ آج قربانیوں کی قلت سے تباہ و برباد ہو رہی ہے اور اگر اب بھی تم نے اپنے مقدس وطن کے لئے تلوار نیام سے نہ نکالی تو سچ مانو تاریخ تمہیں ملعون کہے گی۔ میں بالخصوص نوجوانوں سے مخاطب ہوں کہ ترک نوجوانو! تمہارے پیش نظر زندگی کو آسان بنانا نہیں بلکہ ذمہ داریوں کا ایک زبردست احساس پیدا کرنا ہے۔ میں تم سے تمہاری ماؤں سے تمہاری بہنوں سے قربانیاں مانگ رہا ہوں ان سے تمہارے خون کی بھیک مانگ رہا ہوں... اپنی قسمت کو قوم کی قسمت سے اپنی حرکت کو قوم کی حرکت سے وابستہ کر دو یہی ہماری کامیابی اور فتح مندی کی دلیل ہے۔ اور پھر ایکبار اپنے اس مضبوط عقیدے کو تمہارے روبرو دہراتا ہوں کہ مستقبل کے بنانے والے

یہ بوڑھے عالم و مولوی نہیں تم ہو؟ اور مستقبل کی ترک قوم تمہیں بننا ہے! وقت نہیں آؤ اس مقدس علم کے سایہ میں جس کے سایہ میں ہمارے اولوالعزم اسلاف نے پناہ لی تھی۔ آؤ اور شاداں و فرحاں نہایت سرعت کے ساتھ یونانی دیوانوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے اپنے اندر زبردست عزم و استقلال جذبہ جانبازی و جاں نثاری پیدا کر لو"۔

تاریخ ترکیہ میں ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۲۲ء وہ مبارک اور مسعود تاریخ تھی جب کہ ظفر مند کمال ایشیائے کوچک کو یونانیوں سے پاک و صاف کرنے کے بعد بوقت صبح عازم استنبول ہوئے۔ لاکھوں ترک اپنے نجات دہندہ کو خوش آمدید کہنے ساحل باسفورس پر جمع تھے اور "غازی" "غازی" کے فلک شگاف نعرے بحیرۂ مارمورا میں جزر و مد کی کیفیت پیدا کر رہے تھے اس اطمینان اور سکون کی ساعتوں میں وہ تاریخی تقریر جو انہوں نے ملک کے لاکھوں انسانوں کے روبرو کی تھی اس کے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"محاربۂ عظمیٰ کی وہ قوتیں جن کا ساتھ آل عثمان نے دیا تھا میدان جنگ سے بری طرح پسپا ہوئیں۔ ہر سمت سے عثمانی فوجوں کے پرخچے اڑ گئے اور خلیفہ کو بے دست و پا کر کے ایک عہد نامہ موڈروس پر مہر خلافت ثبت کی گئی۔ درحقیقت یہ عہد نامہ نہایت سخت اور تباہ کن شرائط پر محمول تھا . . . ادھر جنگ عظیم کی چنگاریاں آئے دن پھیلتی گئیں اور جنگ کی طوالت دنیا کے ایک بڑے حصے کو دیوالیہ اور قلاش کر رہی تھی اور وہ قوتیں جنھوں نے بلا سوچے سمجھے قوموں اور ملکوں کو فتنہ کا بازار گرم کرنے پر آمادہ کیا تھا اب انہوں نے چپ سادھ لے رکھی تھی اور میدان کارزار سے فرار ہو کر اپنی عزیز جانوں کی امان مانگ رہے تھے . . . . وہ عاقبت نااندیش حکومت اس قتل عام سے گھبرا کر اپنے تاثرات کو برقرار رکھنے کے لئے ایک ذلیل اور حقیر راہ کی متلاشی تھا۔ پست ہمتی، کمزوری اور غداری مجلس وزراء اور اس کے صدر داماد فرید پاشاہ کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور ادھر قوم آرام طلبی اور سہل انگاری کے سیلاب میں بہ رہی تھی ــــ فوجیوں کی عام حالت یہ تھی کہ وہ آلات حرب سے محروم ہو چکے تھے اور وہ تنخواہ، راشن اور اسلحہ کے بروقت نہ ملنے کی وجہ سے فاقہ کشی اور ننگے پن کے کٹھن دن گذار رہے تھے . . . اب اس مقام پر ہم فتح مند قوموں کی صف میں پیش پیش نظر آ رہے ہیں ــ"

اتاترک نے انبساط کے عالم میں ترکوں کی قربانیوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا "قوم کے مختلف نمائندوں نے اپنے طبقات کی مختلف تجویزیں میرے روبرو پیش کیں کہ حکومت برطانیہ سے اچھے تعلقات قائم کئے جائیں اور یہ کہ امریکہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ ترکوں کے مطالبات منظور کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ کرے، ان مذکورۂ بالا تجاویز کی حمایت ایسے طبقہ نے کی جو سلطنت عثمانیہ کو علیٰ حالہ ایک مجلس شوریٰ کے تابع برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ایک دوسرے طبقہ نے اس امر پر کافی زور دیا کہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کو کامل طور پر سیاسی تمدنی آزادی عطا کی جائے۔ ملک کے ایک اور طبقہ نے سلطنت عثمانیہ اور خلافت کے دوبارہ استقلال پر زور دینا چاہا لیکن ملک کی ایک عظیم اکثریت نے ترکوں کی حیات قومی کو برقرار رکھنے کے لئے سلطنت عثمانیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر لیا ہے ــــ، یہ کہ مختلف طبقات کی مختلف تجویزیں میرے لئے

تسکین قلب کا باعث دبن سکیں کیوں کہ ان آرار کو قوم کی ہمدردی اور اخلاقی امداد حاصل نہیں۔ درحقیقت موجودہ انقلاب عظیم نے ہماری مقدس سلطنت کو متزلزل کر دیا ہے اور وہ نہایت سرعت کے ساتھ ہلاکت اور بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ موت اور زوال کے چکر نے اس کے اعضاء کو کاٹ کاٹ کر اس کے بے شمار حصے بخرے کر دئے گئے تھے اور ترکوں کو صرف ایک "اجڑا ہوا جھونپڑا" دیا گیا تھا جس میں معدودے چند ترک اپنا منہ چھپا سکتے تھے.. سلطنت آل عثمان اور آزادی پاشا خلیفہ حکومت سوائے چند مہمل اور بے معنی الفاظ کے کچھ حقیقت نہیں رکھتے.....

اتاترک نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔" ان حالات کے تحت صرف ایک ہی رزولیوشن پاس کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ایک نئی حکومت کی تشکیل کی جائے جس کا سنگ بنیاد جمہوریت کے پر ہوا اور ایسی جمہوریت جس کی فضاء میں ترکی کا ہر بوڑھا" جوان" عورت اور ہر بچہ لامحدود اور لاانتہا ہی آزادی ہی آزادی کے گن گانے لگے.... حضرات یہی وہ رزولیوشن ہے جس کو قوم کی بڑی اکثریت کی اخلاقی امداد حاصل ہے... یہ میری آواز نہیں کہ سلطنت عثمانیہ کو اب برقرار نہ رکھا جائے۔ بلکہ یہ قوم کی آواز ہے۔ اسی آواز جس کی نمائندگی عصمت پاشا جو میرے مقابل کھڑے ہیں کر رہے ہیں ...ہاں حضرات یہی وہ قوم کی آواز ہے جو ہمارے قلوب سے پیہم ٹکرا رہی ہے اور جس کے تصور کو ہم نے اپنے قلوب پر بھی مرتسم کیا ہے اور اب جیسے ہی ہم سرزمین ایشیا کے روح افزا مقام انگورا پر قدم رکھیں گے۔ اس رزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں گے۔ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اب بادشاہوں کی اور خلیفاؤں کی حکومت ہماری سرزمین پر حکومت نہیں کر سکتی۔ تمہارے قلوب۔ تمہاری جمہوریت تمہارے قلوب پر قابلِ رشک حکومت کرے گی ــــ" فقط

افتخار احمد (عثمانیہ)

نذرِ بتانِ حرم

علامہ عیشؔ

مدہوش انہیں باتوں سے ہو جاؤں گا
تم سامنے بیٹھے ہو میں کھو جاؤں گا
افسانہ سناؤ نہ شبِ وصل مجھے
برسوں کا ہوں جاگا ہوا سو جاؤں گا

غزل

جناب افتخار احمد سحر (عثمانیہ)

وہ ہیں بالیں پر مری اور نزع کا ہنگام ہے
صبح کی رنگینیوں میں امتزاج شام ہے

ہر نمود صبح کا انجام وقت شام ہے۔
حسن والے دیکھ لے یہ حسن کا انجام ہے

بارگاہِ ناز گر دیدار خاص و عام ہے
داستان عشق۔ باطل حسن بھی بدنام ہے

ڈھونڈتا ہوں اپنی منزل منزل مقصود پر
کاروان گردش میں ہے یا گردش ایام ہے

سانس جب تک تن میں تھی ہنگامہ دنیا بھی تھا
بند کیں آنکھیں تو پھر آرام ہی آرام ہے

پی رہا ہوں اُن کی آنکھوں سے شراب زندگی
اب نہ شیشہ ہے نہ ساقی ہے نہ رنگین جام ہے

پھر سحر لے کر اُٹھا اپنی متاع زندگی
دست نازک میں کسی کے تیغ خون آشام ہے

سلک
ٹوئیڈ
سوتی
ریشمی
مردانہ و زنانہ ملبوسات
کا
واحد مرکز
اکبر برادرس
عابد روڈ حیدرآباد دکن

دنیا عالم اسباب ہے۔ حیوانات ہوں یا نباتات و جمادات ہر ایک کی بقا اسباب حیات پر مبنی ہے۔ قدرت نے اپنی کائنات میں مخلوقات کے لئے ہر ایک کو دوسرے کا سبب حیات بنایا۔ حیوانات مطلق۔ نباتات و جمادات کی تخلیق انسان کے لیئے کی ہے اور وہی تمام مخلوقات میں اشرف و ممتاز ہے۔ قدرت نے اس کو شعور کی وہ نعمت عظمیٰ عطا کی ہے جو جسمی طاقت پر فوقیت رکھتی ہے۔ بجز انسان کے تمام مخلوقات عالم کو جسمی طاقت حاصل ہے لیکن شعوری قوت سے ہر مہم پر انسان کو فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ آج ایجادات اور فنی و صنعتی مظاہرات اسی شعور کی کرشمہ سازی ہے موجودہ جنگ کی میکانی قوت جو بحر و بر اور فضا پر حاوی ہے اسی کا معجزہ ہے علمی دنیا میں اس کی ترقیاں اور ان تاریخ پر اپنی کامل ضیا پاشیوں کی شہادت دے رہی ہیں۔ اس کا فیض بیکراں جس طرح ماضی میں تھا حال بھی اس سے خالی نہیں ہے اور نہ مستقبل محروم رہ سکتا ہے

شعور کا فطری تقاضہ ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بے طلب عطا کرے جن لوگوں نے علمی دنیا میں شعور معمولی سے کام لیا انہوں نے دماغی شعور سے کہیں زیادہ اپنی قوت کو منوایا ہے۔ چنانچہ سیاست حاضرہ میں مدبران سیاست سے زیادہ آمرین دھر کی عملی قوت کو برتری حاصل ہے۔ ہٹلر۔ مسولینی۔ اتاترک علمی دنیا کے ہیرو نہیں ہیں۔ میدان عمل میں ان کا شعور کام کر رہا ہے انگریزی کا مقولہ ہے کہ انسان اپنی قسمت کا معمار ہے اقبال نے بھی درس عمل ہی دیا ہے۔ اور اس کا یہ شعر ایک دوسرے انداز میں اس مطلب کو ادا کر رہا ہے۔

کہ تو تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے۔

مذاہب نے بھی اسی کی تعلیم دی اور یہ نظریہ قائم کیا کہ عالم بے عمل کو جاہل باعمل پر ترجیح نہیں ہے عبادات میں عمل نہ رکھا جاتا تو مذہب اور اس کا مقصود یعنی خدا بے معنی ہو کر رہ جاتے۔ سائنس کی نظری تعلیم ہی رہتی تو ایجادات کا وجود و تصور پیدا نہ ہوتا علم کا نتیجہ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نتیجہ ہی مقصود حیات ہے،

انسان من حیث الفرد کچھ نہیں۔ اس کے اگر تعلقات مدنیت منقطع کر دئے جائیں تو وہ خالص حیوان سے زیادہ دکھائی نہیں دے سکتا۔ تہذیب و تمدن تکمیل مایحتاج حیات کے بغیر بن نہیں سکتا۔ ضروریات زندگی ہی زیور تہذیب و تمدن ہے۔ انسان قدرتاً مجبور ہے کہ وہ جب تک دوسرے کی ضروریات کا سامان حیات نہ کرے اس کی ضروریات کا سامان مہیا نہیں ہو سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان خود غرض واقع ہوا ہے لیکن بہ نظر

یہ خود غرضی صرف اس حجت سے دور ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے اغراض کے اغراض مقدم ہیں۔ اس کی ضروریات دوسرے کی مایحتاج کے پورا کرنے پر حاصل ہوتی ہیں۔ اور قدرت نے بھی اسباب عالم مخلوقات ہی کو بنایا ہے۔ غیر ذی روح و غیر شعور ذی روح سب انسان کی تکمیل حاجات کے اسباب ہیں۔

فرد سے جماعت انہیں اغراض کی فراہمی کے لئے قائم ہوئی اور جماعت کا نظم و نسق اغراض ہی کے نظم و نسق کے لئے بنایا گیا۔ حکومت جائز حقوق کی حفاظت اس کے استعمال و استفادہ کلی کے لئے متشکل کی گئی۔ قوانین تعمیل کے لئے مدون ہوئے۔ اور انسانی مدنی زندگی کا شیرازہ بندی کی گئی۔

یہ نظریۂ اصول متعارفہ کے طور پر تمام دنیا کا مسلمہ ہے کہ اول خویش بعد درویش فرد۔ جماعت۔ حکومت سب اس کے پابند اور اس پر کاربند ہیں۔ حدیث شریفہ بھی ہے اور انگریزی مقولہ ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔

مایحتاج حیات کے جس قدر اسباب روزی ہیں وہ سب انسانوں اور ملکوں کو قدرت نے عطا کیے ہے جس ملک کی جو پیداوار قدرتی یا زرعی ہے اس کے استفادہ کا حق سب سے پہلے اسی کے بسنے والوں کو حاصل ہے لیکن جو ممالک دوسرے ملک کی پیداوار کو اپنے لئے حاصل کرتے ہیں وہ اہل ملک کا حق سلب و غصب کرتے ہیں اس فطری حق کو حاصل کرنا اہل ملک کا فریضہ ہے اگر ان کی غفلت ہے تو بقول شاعر

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اہل ملک کو چاہئیے کہ اپنے مستقبل کو بنانے اور اپنی قسمتوں کو جگانے کے لئے اپنی ملک کی پیداوار سے مصنوعات بنائیں تجارت کریں اور فنی طریقہ پر اس کا استفادہ استعمال کریں۔ اپنی مایحتاج کے خود کفیل ہوں غیروں پر تکیہ کر کے خود کو اپاہج اور دوسروں کا محتاج نہ بنالیں ایسے ان کی برتری نہیں بلکہ پستی ہے۔ جو ممالک خام پیداوار دوسرے ممالک سے لیکر ان کو اپنا تیار کردہ مال دیتے ہیں وہ زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں اور ان کو برتری بھی حاصل ہوتی ہے۔ خام پیداوار کو ارزاں قیمت میں دیکر مصنوعات غیر ملکی کو گراں قیمت میں لینا عقلمندی کی دلیل نہیں ہے اور شعوری قوتِ عمل کے خلافِ منشار ہے جن ممالک کو قسام ازل نے زرخیز بنایا ہے اُن کے قدرتی انعام سے استفادہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے اور وہ عظمت و وقار کو بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

اہل ملک کا فرض ہے کہ شعورِ علمی و عملی سے بہرہ ور ہوں اور اپنی قسمت کو بنائیں عظمت کو حاصل کریں۔ فقط

غازی معین الدین بی۔ اے ایل ایل بی۔

آرمنی پان
خریدتے وقت اس پتہ کا خیال رکھیے
سید محمد سعید الدین تاجران پان آرمنی
سدی عنبر بازار
حیدرآباد دکن
ٹیلیفون ۲۳۴۱

ایچ۔ ایم جلال میاں
تاجران سامان آہنی
وسول ایجنٹس ایگریکو ٹولس ٹاٹا کمپنی
افضل گنج
حیدرآباد دکن
ٹیلیفون نمبر ۳۱۷۷

ڈاکٹر سر محمد اقبال

۱۔ زندگی!

پہاڑی چشمے نے فلک بوس چوٹیوں پر شاہین بچے کی طرح پرورش پائی پرفستان کی پریوں نے دودھ پلایا اور لعل وجواہر کھیلنے کو دیئے۔ عنفوان شباب میں اس کی سیمابی فطرت نے وسیع تر دنیا تلاش کی اور وہ ہنستا کھیلتا۔ اچھلتا کودتا گاتا گنگناتا۔ گرجتا چلاتا اور ہنستا ہنساتا میدان میں جا پہونچا۔ اب وہ آہستہ خرام تھا۔ دل میں گہرائی اور دماغ میں غور و فکر کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن طفلی کی بے چینی اور تڑپ اب بھی موجود تھی دوپہر ہو چکی تھی لیکن آفتاب بادلوں کے پردوں میں چھپا ہوا تھا اُسے منزل کی خبر نہ تھی لیکن ناکامی کے خیال سے مایوس نہ ہوتا تھا اور سوچتا غور کرتا حسین وجمیل موجوں سے ہنسی کھیلیاں اور سرگوشیاں کرتا۔ "تیز ترک گام زن منزل ما دُور نیست"

الاپتا چلا جا رہا تھا یکایک بحر زندگی کا ساحل نظر آیا وہ ایک والہانہ انداز سے بڑھا اور "عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کا نعرہ مار کر ہم آغوش ہوا اور خود بھی سمندر ہیں تھا۔

اس کی زندگی ایک مسلسل اُمید تھی اور اس کا مقصد مردوں کا جلانا۔ مضراب حیات اس کے ارباب اُمید کو چھیڑتی اور اس کے نغمے بانگ درا اور ضرب کلیم بن کر نیند کے ماتوں کو بیدار کرتے زبور عجم بن کر وجد اور محویت طاری کرتے بال جبریل بن کر مسافر کے سر پر سایہ افگن ہوتے اور خودی و بےخودی کے اسرار و رموز آشکار کر کے حیات جاوید کا پیام دیتے۔

پرفستانی پریوں کے آغوش سے نکلا تو شیدا اُس کے دامن لعل وجواہرات بھرے میدان میں پہونچا تو اُمید کی کھیتیاں سرسبز کیں اور افسردہ دلوں کو حیات تازہ بخشی اور اب اپنے بحر بیکراں سے موتی۔ رولنے کی دعوت دے رہا ہے زندگی نام ہے زندہ رہنے اور زندہ کرنے کا۔

۲۔ شاعری!

نغمہ سنجان چمن پروں میں سر ڈالے کسی گہرے سوچ میں ڈوبے بیٹھے تھے گرم گرم ہوائیں افسردگی و پژمردگی کے تھپیڑے مار رہی تھیں اور دوشیزہ بہار بلبیں نا اُمیدی کے آنسو بہا رہی تھی یکایک کسی نامعلوم دنیا سے ایک شیریں نوا بلبل ہزار داستان نے اس اُجڑے گلستان میں نغمہ سرائی شروع کی۔ اس کے مسیحا نفس ترانوں کو سن کر زمین نے سانس اور نسیم صبح نے جھرجھری سی لی افسردہ کلیوں نے منہ کھولے اور پھولوں نے مسکرانا شروع کیا۔ باغبانوں نے انگڑائی لی۔ اُٹھے اور گلشن ۔۔۔ کو مرجھایا ہوا دیکھ کر پانی کے بجائے آنکھوں سے آب حیات برسایا بہار مسکرائی اور دنیا ہنسنے لگی زندگی نے دوبارہ جنم لیا شاعروں نے نظمیں لکھیں مصوروں نے تصویریں بنائیں۔ اور مغنیوں نے وجد آفرین نغمے گائے۔ دن عیش وطرب میں گذرا شام ہوئی اور اس شیریں نوا بلبل مسیحا نفس کو نہ جانے کون اور کیا یاد آیا اب اس کے نغمات طرب انگیز نہ تھے ان میں درد تھا۔ بےچینی تھی اور اضطراب ایسا جیسے پپیہے کی پی کہاں میں مظلوم کی آہ اور مہجور کی نیند میں۔ اس نے چمن کو الوداع کہا۔ شاعر کی آنکھ سے آنسو بہے مصور کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور مغنی نے رباب پٹک دیا۔

مسلم ضیائی۔ (ایم ۔ ۔)

تمنا

از ظفر اعثمانیہ

حدیث دو عالم کی تفسیر ہیں ہم
سہانے سے خوابوں کی تعبیر ہیں ہم
نئے آنیوالوں کی تقدیر ہیں ہم
زمانے کے ہاتھوں کی شمشیر ہیں ہم

فرشتوں سے اونچی ہے ہستی ہماری
ستاروں سے اونچی ہے بستی ہماری

عزائم ہوں جن میں وہ نغمے سنائیں
جو سوتے ہیں خوابوں سے ان کو جگائیں
ضیائے سحر بن کے عالم پہ چھائیں۔
نئی زندگی کے نئے گیت گائیں

جھکے آ کے قدموں پہ سارا زمانہ
رہے یاد صدیوں ہمارا فسانہ

کہیں سوز بن کر کہیں ساز بن کر
دھڑکتے ہوئے دل کی آواز بن کر
جوانی کی پُر کیف پرواز بن کر
ہوا میں اڑیں روح شہباز بن کر

ہماری نگاہیں دو عالم سے آگے
ہماری صدا سے دلِ قوم جاگے

اُٹھیں اور اُٹھکر قیامت مچادیں
عمل اور تمنا کا جادو جگا دیں
ہمیں موت کا جام پینا پڑے گا
بر حق ہے ہمیں مر کے جینا پڑے گا

الٰہی دل اپنے خلش آشنا کر
الٰہی ہمیں غم کی دولت عطا کر

"ناگہانی کون جانتا ہے۔ اگر یہ گولی چل جائے تو کیا ہو" آپا نے غصہ سے کہا اور ہم بہت ہی حیرانی میں منہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔

ہوا یہ تھا کہ بابر نے شکار کے لئے گولیاں بنوائی تھیں۔ اس کے لئے جو کچھ انتظامات ہوئے وہ یہ تھے کہ ایک اتوار کو صبح کے وقت عبدالحامد خاں کہیں سے گولیاں بنانے والا سانچہ مانگ لائے۔ دس پیسے کہیں سے چوری کئے گئے اور ایک لکڑی والے کے یہاں سے تھوڑی سی لکڑیاں چرائی گئیں۔ چولہا جلا۔ سیسہ پگھلایا گیا۔ اور پھر گولیاں بنیں۔ اس طرح یہ گیا، سادہ سامان اور یہ تیار شدہ گولیاں بالکل خلاف قانون تھیں۔ اور ان کے وجود سے تو اس بات کا ڈر پیدا ہو چلا تھا کہ کوئی دفعہ صاحب ہمارے گھر میں تشریف لائیں گی۔ لیکن یہاں کی پولیس کی ناپولیسی کا ہمیں اسی وقت علم ہوا جب گولیاں بخیریت تمام بن کر تیار ہوئیں اور انہیں کہیں حفاظت سے رکھا بھی نہیں گیا۔ کوئی دس بجے کا وقت تھا کہ بابر کو اور ہم کو ایک قسم کی سنک سوار ہوئی۔ ہم نے بابر سے کہا "بندوق کی نالی میں گولیاں ڈال کر دیکھیں وہ ٹھیک بھی ہوتی ہیں یا نہیں" اور اس نے سعادتمندی سے ہماری ہاں میں ہاں ملائی۔ دوسرے لمحے ہم دونوں بندوقوں والے کمرے میں تھے۔ ایک بندوق اٹھائی گئی۔ اور اس کی نالی میں گولی ڈال کر دیکھی۔ "بالکل ٹھیک" ہم نے کہا۔ پھر دوسری گولی ڈالی گئی اور وہ بھی ٹھیک نکلی۔ اب تیسری گولی ڈالی گئی۔ بابر نے کہا "یہ بھی ٹھیک ہے" لیکن ہم کو اس کے ٹھیک ہونے میں پاؤ بھر یا آدھ سیر شک تھا اس لئے بابر نے وہ گولی پھر نالی میں ڈالی۔ بس ڈالی ہی تھی کہ آپا نازل ہو گئیں اور وہ "ناگہانی" والا جملہ عرض کر دیا۔

حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہم نے اپنا منہ بند کیا اور سر کھجلانے لگے۔ آپا نے جو اسٹینڈ اینڈ یا اٹینشن کی حالت اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا اثر ہم پر بہت برا پڑ رہا تھا۔ اور ہم ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے۔ لیکن بہرحال ہمیں اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔ اس لئے ہم نے بہت عاجزانہ انداز سے سر جھکا کر کہا۔

"صاحب آپ تو بلاوجہ بگڑنے لگتی ہیں۔ یہ خالی گولی کسی کا کیا بگاڑے گی"

مزید صفائی پیش کرتے ہوئے ہم بالکل ایک "ماسٹر صاحب" بن گئے اور بہت ہی دلنشین انداز میں سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھئے جب تک یہ گولی کارتوس میں نہ رکھی جائے۔ اور وہ کارتوس بندوق کی نالی میں نہ رکھا جائے۔ اور

جبتک گھوڑا نہ چڑھایا جائے اور لبلبی نہ دبائی جائے اس وقت تک کسی کے بال بیکا ہونے تک کا خطرہ نہیں ہے۔ اور ناگہانی تو بس ایک وہم ہے۔ ایک خیال ہے۔ ایک خواب ہے۔"

آپا کہنے لگیں "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ——"

"لیکن ویکن کچھ نہیں" ہم نے جرح کرتے ہوئے کہا "بغیر بارود اور کارتوس کی مدد کے نہ تو گولی چل سکتی ہے اور نہ ناگہانی کا وجود ہو سکتا ہے"

آپا چلا اٹھیں "میری بات مت کاٹا کرو جی"

اور ہم بالکل بھیگی بلی بن گئے۔

آپا نے اپنے پُرمغز اور پُراز دلایل لیکچر کا آغاز کیا اور ہم ایک سعادت مند صاحبزادے کی طرح سب کچھ کان لگا کر سنتے رہے۔

آپا نے کہا "تم لوگ میرے سامنے پیدا ہوئے۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اتنے بڑے ہوئے اور مجھ سے زبان لڑاتے ہو۔ شرم تو نہ آتی ہوگی؟ خیر وہ تو زمانہ ہی خراب ہے۔ آجکل اسکولوں میں لڑکوں کو تمیز سکھائی ہی نہیں جاتی۔ تمہیں تمیز کہاں سے آئے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ ابھی اس دن وہاں جالس میں اسماعیل صاحب کے یہاں دو بچے کھیل رہے تھے۔ ایک نے بندوق اٹھا کر دوسرے کی طرف دکھائی۔ دھائیں کی آواز ہوئی اور وہ بیچارا مر گیا اسی لئے میں تم سے کہہ رہی تھی ناگہانی کون جانتا ہے۔ تم اس میں گولی ڈالتے ہو اگر یہ خدانخواستہ چل جائے اور کسی کے لگ جائے تو تم کیا کر لوگے؟"

ہم نے آپا کی کچھ غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے "ارے" کہا ہی تھا۔ کہ آپا کا پارۂ غضب نقطۂ اُبال سے گزر کر کچھ اور آگے بڑھ گیا اور وہ اس طرح فرمانے لگیں "میں کہتی ہوں کہ تم لوگ اس قدر بدتمیز کیوں ہو گئے ہو۔ نہ بڑوں کا کوئی ادب ہے نہ لحاظ۔ تم لوگوں کے ذرا بھی عقل نہیں ہے۔ بیہودہ کہیں کے۔"

بابر نے گھبرا کر کہا "لیکن پھوپھی جان ابھی ہماری عقل داڑھ تو نکلی ہی نہیں"

بس غضب ہی تو ہو گیا۔ آپا کٹے ہوئے کنکوے یا کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح کمرے سے یہ بڑبڑاتی ہوئی نکل گئیں۔ "بالشت بالشت بھر کے چھوکرے بحثیں کیسی کرتے ہیں۔ ابھی دودھ کے دانت تک تو گرے نہیں اور چلے ہیں بڈھوں ایسی باتیں بنانے۔ میں اب ان لوگوں سے بولنا بھی نہیں چاہتی۔" اور اس حادثہ کے بعد اشفاق پر برس پڑیں جو ننھے سعید کی طرف ایک لکڑی دکھا رہا تھا۔

"نالائق" آپا نے چلاتے ہوئے کہا۔ "ناگہانی کون جانتا ہے۔ ابھی جو اس کی آنکھ میں یہ لکڑی گھس جائے تو کیا تو اس کی آنکھ بنا دے گا۔"

اور اس کے بعد میاں شفاق کو ڈھیر بھر مار کھانی پڑی۔ ابھی اس کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کسی نے آپا سے کنجی مانگی۔ بھلا بتایئے جب بادل گھر گھر آئے ہوں اور پانی برسنے لگے تو پھر تھوڑی دیر میں بارش کیسے رک جائے۔ کنجی کا معاملہ ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اب آپا کی گرج اور برس دونوں دیکھنے کے قابل تھیں۔

"کہاں ہے کنجی تم نے دیکھی ہے؟" مجھ سے ذرا نرمی سے پوچھا۔

"ہم کیا جانیں" ہم نے کسی قدر تیم خاکساریت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ اور پیچھے سے کھسک گئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہونا تھا ہوا یعنی آپا چلائیں، چیخیں۔ اور پھر سارے گھر میں تلاش شروع ہوئی۔ ہم کو ایک ایک واقعہ کی خبر بہت معتبر ذرائع سے معلوم ہوتی رہی۔ بالآخر گھر کی اس ہنگامہ پرور فضا کی جاذبیت نے ہمیں پھر گھر میں جانے پر مجبور کیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا جا رہا ہے۔ کیا بڈھے اور کیا بچے سب اس مہم میں بری طرح منہمک ہیں۔ آپا کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے ایک لائق کمندار کی طرح احکام جاری کر رہی ہیں۔ "میرے اٹیچی کیس میں دیکھو۔" "الماری میں دیکھو" "ہوادار کے نیچے تلاش کرو"۔ "تکیہ کے نیچے دیکھو" بہرحال ایک عجیب ہنگامہ تھا۔ میرے دل میں بھی ایک خیال نے گدگدی پیدا کی۔

ڈاکٹر اکبر کے یہاں پہنچے۔ ان سے ان کی وہ خوردبین مانگی جس کا ایک شیشہ زمانہ ماضی کی داستان بن چکا تھا۔ اور دوسرا شیشہ بھی کچھ دنیا والوں سے ایسا بیزار معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کہہ رہا ہو۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

ہم پھر گھر میں نازل ہوئے۔ اور باورچی خانے کے قریب جو نالی تھی۔ اس میں خوردبین کے ذریعہ کچھ دیکھنے لگے۔ آپا چلائیں "یہ کیا ہو رہا ہے"

ہم نے ناک پر خوردبین کو رکھے ہوئے کہا۔ "ناگہانی کون جانتا ہے۔ ممکن ہے کنجی اس نالی میں چلی گئی ہو۔ میں خوردبین کے ذریعہ دیکھ رہا ہوں۔ اور اس کا چھلا شاید دکھائی دے رہا ہے۔"

آپا پہلے تو اس خبر کو سن کر بڑی خوش ہوئیں اور اس انداز سے میری طرف بڑھیں گویا انہیں یقین ہی آگیا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر کھڑی ہو گئیں شاید انھوں نے میرے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ بس گرج پڑیں۔

"اب کیا پوچھنا ہے۔ مجھے چڑانے بھی لگے ہیں" اور اس کے بعد خدا جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ اور پھر کمرے کے باہر نکل آئیں۔ اب کی بار مار پڑ ڈانٹ پڑنے ہی والی تھی کہ آپا کا ہاتھ جیب تک پہنچا اور وہاں کنجی منا نے چھن سے بج کر اپنے وجود کا اعلان کیا۔ اور اس کے بعد آپا نے نہایت احتیاط سے کنجی جیب سے نکالی گویا انہیں اس کے کھو جانے کا خطرہ پھر ہو گیا تھا۔

ہم نے آپا کو کنجی ملنے پر مبارکباد دی۔ لیکن انہوں نے ہماری مبارکباد کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپا کنجی

ملنے سے بہت خوش تھیں۔

شام کو چائے کے وقت آپا سے پھر ملاقات ہوئی تو ہم نے کہا "آپا وہ کتنی ملنے کی خوشی میں دو پیسے کے بتاشے تو بانٹ دیجئے" اور آپا صرف مسکرادیں۔

رات کو جب انگیٹھی جل رہی تھی اور سب لوگ ایک جگہ جمع تھے ننھے خالد نے آپا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر پوچھا "آپا یہ ناگہانی تہاں (کہاں) رہتی ہے؟"

ہم سب ہنس دئے اور آپا تھوڑا سا چراغ پا ہوئیں اس بادل کی طرح جو صرف گرجتا ہے برستا نہیں۔

سید معین الدین (علیگ)

غزل

از خیرات تانڈوری

یہ کس کا انتظار کیئے جا رہا ہوں میں — کیوں دل کو سوگوار کیئے جا رہا ہوں میں

شاید کوئی فریب میں لذت ہے اے ندیم — جو اُن پہ اعتبار کئے جا رہا ہوں میں

اے دوست گرچہ زیست تڑپنے کا نام ہے — لے غم کو استوار کیئے جا رہا ہوں میں

وہ سامنے گر آئیں چرالوں گا مستیاں — نظروں کو ہوشیار کیئے جا رہا ہوں میں

نغموں کی روح اصل میں ہے اک نوائے درد — یہ راز آشکار کیئے جا رہا ہوں میں

اک آہِ زیرِ لب میں نہ جانے تھا کیا اثر — اُن کو بھی بیقرار کیئے جا رہا ہوں میں

میں کیا ابھری بساط ہی کیا۔ کیا لٹاؤں گا — چند اشک ہیں نثار کیئے جا رہا ہوں میں

خیرات اُس کو اپنا بنا کر دکھاؤں گا
وہ رنگ اختیار کئے جا رہا ہوں میں

رات آدھی گزر چکی تھی، سردی بڑھتی جا رہی تھی، ہوا کے تیز و تند جھونکے دوران خون کو منجمد کئے دیرہے تھے، وہی ہوا کے جھونکے درختوں سے مس ہو کر دلاویز راگ چھیڑ کر کسی فردوسی نغمے کی یاد دلا رہے تھے، دور — چاندکی روشنی میں کہر کی سفیدی نظر آرہی تھی۔ تاروں بھرا آسمان اور چاند دعوت عیش دے رہے تھے ہر طرف سکوت اور خاموشی کا ایک ہوشربا طلسم چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر یا اپنی سریلی آواز سے فضائے بسیط میں کچھ ارتعاش پیدا کردیتا پھر اس کے بعد ہی ختم نہ ہونیوالا سناٹا ——— ہنسلی اب تک انتظار میں کھڑی تھی اس کی نظر اسی راستے پر لگی ہوئی تھیں جس راستے سے وہ دھرمو اس سے ملنے کے بعد لوٹ گیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج شام پڑتے ہی آجائیگا۔ "مگر کیوں نہیں آیا؟" ہنسلی کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ دور کسی کھیت والے نے "ہوت ہات دھوت" کہکر پکارا اور کائنات کی خاموشی میں رخنہ ڈال دیا۔ راستہ پر اچانک سیاہ ہالا سا بنا اور پھر غائب ہو گیا۔ زیادہ دیر دیکھنے اور شدید انتظار کے باعث اس کی آنکھیں اُسے دھوکہ دینے لگی تھیں اس کا دل کہہ رہا تھا "میں نے آج فضول بابو کو کھیت میں رہنے دیا — میں اپنی جھونپڑی میں آرام سے سوئی ہوتی۔ اُسی نے تو کہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا پھر یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے کھیت میں بھی تو کوئی نہیں ہے ——— آگ بھی جلتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی" وہ کھیتوں کے ناپیدا کنار سلسلے کی طرف دیکھنے لگی اس کی نظر ایک بیڑا سے پر رک گئی ایسا معلوم ہونے لگا کہ دھرمو کھڑا اس کی بےچینیوں کا تماشہ دیکھ رہا ہے — اس کی معصومیت اور بھولے پن پر مسکرا رہا ہے۔ وہ حرکت کرتا ہوا بھی معلوم ہونے لگا تھوڑی دیر ہنسلی پر جمود کی سی کیفیت طاری رہی لیکن جب وہ جان گئی کہ وہ ایک "ہراسہ" ہے تو اس کا کیف آور تخیل خاک میں مل گیا۔ اس نے ایک نہ ہد شکن انگڑائی لی۔ نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگی اس کی میٹھی میٹھی آواز نغمے کا اتار چڑھاؤ اور فضا کی خاموشی گرد و پیش کی ہر شئے کو مدہوش بنا رہی تھی۔ وہ رک گئی۔ دور کوئی سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بغور دیکھنے لگی لیکن وہ بھی درختوں کی اوٹ میں آکر چھپ گیا۔ جاڑا بڑھتا جا رہا تھا شبنم سے اس کی اوڑھنی بھی گیلی ہو گئی تھی۔ اب انتظار کی تاب بھی باقی نہ تھی۔ وہ اپنے کھیت میں داخل ہو گئی اور مچان پر جا کر سو رہی لیکن خیالات منتشر ہو گئے اُسے گدگدی سی ہونے لگی معلوم ایسا ہونے لگا کہ دھرمو کی انگلیاں اس کے جسم پر چل رہی ہیں اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اس کا دل کہنے لگا "کاش دھرمو آجاتا!"

اب چاندرات کی وادیوں میں سسکیاں لے رہا تھا اندھیرا چھا رہا تھا ہنسلی چونک کر اٹھی اُسے کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی دیکھا تو کوئی نہیں۔ اس کی اُمیدوں کا دیا جھلانے لگا دُور کتے بھونک رہے تھے ہنسلی پر نیند مسلط ہو گئی۔ وہ سو گئی ــــــ

دُور سے دھرمو چٹا پیتے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے آ رہا تھا کھیتوں کے قریب پہنچتے ہی اسکی نگاہیں بیقرار ادھر اُدھر پڑنے لگیں اور ہنسلی کو نہ پاکر ہر جگہ سے مایوس واپس ہونے لگیں۔ کنارے پر آکر وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ پھر بغور دیکھا لیکن ہنسلی نظر نہ آئی کھیتوں میں داخل ہو کر مچان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچتے ہی خیال آیا "اگر ہنسلی نہ ہو تو!" وہ رک گیا تھوڑی دیر کے لئے۔ لیکن کچھ نتیجہ نہ نکال سکا آخر تھرتھراتا ہوا پاؤں مچان پر رکھ ہی دیا ایسا محسوس ہوا کہ ہنسلی سب کچھ دیکھ رہی ہے ڈرتے ڈرتے وہ مچان پر گیا چٹے کی چنگاریوں کی روشنی ہنسلی کے چہرہ پر پڑ رہی تھی بہت دُور کوئی کھیت کا محافظ کسی جنگلی جانور کو دیکھکر "ہوت ہات ہوت" کا شور مچا رہا تھا۔ ٹیٹی رام اپنی دلفریب آواز وسعت فضا میں پھیلا رہا تھا۔

دھرمو نے جب مچان پر ہنسلی ہی کو محوِ خواب دیکھا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ پاگل سا ہوا جا رہا تھا جب چٹے کا دم کھینچتا تو اس کی روشنی ہنسلی کے چہرہ پر پڑتی۔ اس کا حسن خوابیدہ نقشے جگا رہا تھا۔ چہرے سے تمکنت و غرور ٹپک رہا تھا۔ دھرمو کے دل کی حرکت بڑھتی جا رہی تھی ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ہنسلی کے چہرے سے ہٹ کر اس کے متناسب اعضاء کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بھرا ہوا جسم۔ سینے کا اُبھار غرض ہر چیز نظروں میں کھپتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر ہنسلی کے جسم پر پڑا وہ بالکل بیخبر سو رہی تھی۔

"ہنسلی؟ سوئی ہو کہ چپ پڑی ہو" دھرمو نے یونہی کہا۔

ہنسلی نے کروٹ بدلی۔

"نہیں بولوگی" "سوئی ہوئی ہنسلی کی ٹھوڑی پکڑ کر دھرمو نے پوچھا۔

ہنسلی نے آنکھیں کھولیں ــــ "کون" کہتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھی۔

"پہچان لو" دھرمو نے مذاق سے کہا

"اوں ــــ" "تم بڑے وہ ہو" ہنسلی نے انداز جانانہ سے کہا اور انگڑائی لی۔

"کیا سمجھی تھیں تم" اُس نے ہنسلی کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کے چہرے کو اپنی آنکھوں کے مقابل لاتے ہوئے کہا۔

"چٹا پھینکدو دھرمو" ہنسلی نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "مجھے اس کی بو نہیں بھاتی"

دھرمو نے دھواں ہنسلی کے منہ پر چھوڑتے ہوئے "یہ لو" کہکر پھینکدیا۔

وت ــ تم بڑے وہ ہو" ہنسلی نے ہاتھ سے دھواں دور کرتے ہوئے کہا۔

ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا آیا ہنسلی نے اپنی اوڑھنی کو خوب لپیٹ لیا دھرمو نے اپنا کمبل ٹھیک کر لیا، کوے زور و شور سے پکارنے لگے۔

"سردی لگ رہی ہے" اس نے ہنسلی کا شانہ پکڑ کر اپنی جانب ہٹاتے ہوئے کہا "کمبل میں آجاؤ"

"اوں ــــ نا" کہتے ہوئے وہ دھرمو ہی کی جانب کھسک رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"آگ جلاؤں؟" دھرمو نے پوچھا۔

"ــــــ میں آگ نہیں سینکتی"

وہ دھرمو سے چمٹی ہوئی تھی باہمی لمس سے دونوں کے جسموں میں ایک بجلی کی لہر کوندنے لگی۔ پرندوں کا ایک غول ان کے کھیت پر سے پروں کی آواز پھیلاتا ہوا گزر گیا۔

"دھرمو یاد ہیں وہ دن جب ہم اور تم ایک جگہ ہی رہتے تھے۔ تمہاری جھونپڑی ہماری جھونپڑی سے ملی ہوئی تھی۔ تم اور میں گائے چرانے جاتے تھے ــــ"

"ہاں! ہاں!! کیوں نہیں!!!" دھرمو نے کہا "میں جامنوں کے جھاڑ پر بیٹھ کر کہتا ہنسلی یہ لینا" تم اوپر کو دیکھتیں اور میں جامن تمہیں دکھا کر منہ میں ڈال لیتا تو تم کہتیں "تم بڑے وہ ہو" اور روٹھ کر جانے لگتیں میں تمہیں بلاتا اور منانا تم لوٹ آتیں۔ نیچے اتر کر تمہاری اوڑھنی میں بہت سے جامن ڈال دیتا ــــ تم مسکرا دیتیں ــ میں خوش ہو کر تمہاری ٹھوڑی پکڑ کر ہلا دیتا ــ"

آج سردی بہت ہے ــ"

"ہاں" ہنسلی نے اپنا جسم کو دھرمو سے زیادہ قریب کرتے ہوئے کہا۔

"ایک دفعہ تم ندی پر پانی پی رہی تھیں" دھرمو پھر کہنے لگا "میں نے ایک جھاڑ کی آڑ سے ایک بڑا پتھر اٹھا کر تمہارے سامنے پھینک دیا تمہارے منہ اور اوڑھنی پر پانی ہی پانی ہو گیا تم ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں۔ میں جب قہقہہ مار کر سامنے آیا تو تم نے کہا تھا "تم بڑے وہ ہو" اور میں تمہارے شانے پر ایک ہاتھ رکھ کر اور دوسرے ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر پوچھا تھا ڈریں تو نہیں ــــ"

"اچھا وہ یاد ہے دھرمو تمہیں" ہنسلی نے بات کاٹ کر کہا۔

"کیا؟" دھرمو نے پوچھا۔

"ایک بار تم ندی میں نہانے کے بعد باہر آکر جسم پونچھ رہے تھے" ہنسلی کہنے لگی "میں نے بہت سا کیچڑ اٹھا کر تم پر دے مارا تھا۔ تم دوڑ کر مجھے پکڑنے آئے لیکن میں نہ مل سکی۔ بہت دیر بعد جب مل گئی تو تم نے مجھے اٹھا لیا اور لیجا کر کیچڑ میں پھینک دیا۔ میں اپنے کپڑے سنبھال کر اٹھی اور تمہیں کوستی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی ــــ

تھوڑی دیر بعد جب میں کپڑے دھوکر پہن چکی تو تم نے مجھے ایک پکا ہوا جامن لا دیا تھا ـــــ میں نے اسے کھا لیا اور مسکراتے ہوئے اس طرح سے تمہارے گلے میں ہاتھ ڈال کر" (ہنسلی نے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے) "کہا تھا بہت اچھے ہیں یہ جامن مجھے اور دو ـــــ تم نے مجھے اور جامن دیئے ـ"

ان کی سانس تیز تر ہو گئیں کائنات پر سناٹا چھا گیا۔ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا ـ ہوا رک گئی ـ تھوڑی دیر کی مدہوشی کے بعد جب انھوں نے اپنے گرد و پیش کو محسوس کیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ہنسلی کا باپ اپنے آپ کچھ بڑبڑاتا اور جوار کے پودوں میں سر سر کی آواز پیدا کرتا آ رہا ہے ـ ہنسلی سے کچھ بن نہ پڑا وہ جھٹ اتر کر اس کے استقبال کو پہنچی بوڑھا کھانسا اور ہنسلی کو دیکھ کر کہنے لگا ـ

" جانتا ہوں تم کیوں آ رہی ہو ـــــ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا "

" کیوں باپو!" ہنسلی نے باپ کے قریب ہو کر کہا

" وہ مچان پر دھرمو ہے نا؟ "

" ہاں باپو میں نے ہی اسے آگ جلانے کے لئے بلایا تھا "

" آگ جلانے یا آگ بجھانے!" اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا ـ

دھرمو مچان سے اتر کر گردن لٹکائے کھڑا تھا ـــــ ہنسلی کانپ رہی تھی ـ

سلسلہ صفحہ [illegible] پر

"دھمو" بوڑھے نے پکارا۔

"دھمو ندامت سے گڑا جا رہا تھا۔"

"تم نے میری ناک نیچی کر دی ۔۔۔ اچھا ہوا کہ میں جلدی آگیا۔ کوئی اور دیکھ پاتا تو ۔۔۔ آج ہی پنچایت بیٹھتی۔ چلے جاؤ یہاں سے ۔ اپنا منہ کالا کرو۔"

ہنسلی کے باپ نے جس عزت و شرافت سے زندگی بسر کی تھی وہ سارے ملباڑے جانتے تھے اس کے صلے میں اسے تانڈے کی نائیکی ملی تھی اور دھمو کا خاندان بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہ تھا۔ دھمو کی شجاعت و شرافت اطراف کے تانڈوں میں مشہور تھی۔ مالدار ہونے سے ہر لمباڑا عزت بھی کرتا تھا۔

دن گذرتے گئے لیکن اب تک ہنسلی اور دھمو کے واقعات منظر عام پر نہیں آئے چار مہینے گذرنے کے بعد ہنسلی کے گھر معلوم ہوگیا کہ وہ "ماں" بننے والی ہے۔

"اب کیا ہوگا" بوڑھے نائیک کا دل متفکر ہوگیا اور اسی دن سے وہ بیمار بھی پڑ گیا۔ عوام میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دھمو نے اس دن سے آج تک ادھر قدم بھی نہیں رکھا حتیٰ کہ کھیت کی حفاظت تک کو نہیں آیا۔ فصل کاٹی گئی اناج اس کے گھر پہنچ بھی گیا۔ لیکن وہ نہ آیا کیونکہ اسے نہ آنا تھا۔ ملباڑوں نے ایک دن نائیک سے ذکر چھیڑ ہی دیا پنچایت بیٹھی بیس روپے کی شراب پانچ بکرے ہضم کرنے کے بعد ہنسلی بے گناہ ٹھیرائی گئی اور دھمو سے منسلک کرنے کا حکم دیا گیا اس فیصلے کے کچھ ہی دن بعد ہنسلی کا باپ اسے اپنے بہو بیٹوں کے سہارے چھوڑ کر چل بسا ۔۔۔ دھمو بھی اس فیصلے سے پہلے ہی ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگیا وہ بڑا خوددار شریف اور نیک طبیعت تھا۔ اسے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی وہ کہیں دور ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اپنے پرائے کا گزر نہ ہو۔ جہاں ہنسلی اور اپنے متعلق کچھ سن نہ سکے۔ نہ معلوم اس کا وہ مضبوط دل جو حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کر سکتا تھا۔ کیوں اتنا احساس اور بودا ہو چلا تھا۔ وہ گیا ۔۔۔ دور اور بہت دور ۔۔۔ قسمت نے یاوری کی تو ریلوے گینگ میں ملازمت بھی مل گئی۔ پندرہ روپیئے ماہوار ۔ غم غلط کرنے کا سہارا شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں سے اپنی عہد رفتہ کی داستان اور ہنسلی کی تمنا کو دل سے محو کرنے لگا۔ لیکن بہت کم کامیاب ہوا ۔۔۔

کبھی کبھی جب وہ اچھی حالت میں ہوتا تو اسے ہنسلی یاد آتی۔ ارادہ کر لیتا کہ "چاہے کچھ بھی ہو رخصت لیکر ہنسلی سے مل آؤں" مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ نراس ہو جاتا اور اس کا شوق دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتا۔ دن گذرتے جا رہے تھے۔ اس کے یہاں آنے کے بعد دو جوار کی فصلیں کٹیں۔ لیکن پیہم سعی کے باوجود بھی وہ ہنسلی کو بھلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ادھر ہنسلی کے باپ کے مرنے بعد اس پر طرح طرح کے ستم ٹوٹنے لگے ماں تو تھی نہیں جو اپنی بیٹی کے عیوب کو چھپالے اور اسے تسلی وہمت دے۔ یہاں تو روز عیوب گنے جاتے تھے۔ راحت کے بدلے رنج ہی ملنے لگا۔ گھر والوں اور پڑوسیوں سے طعنے سنتے سنتے اس کے کان تھک گئے۔ مشکل کام اس کے سپرد کئے جانے لگے۔ سڑی گلی غذا دی جانے لگی۔ پہلے پہلے تو اسے انتہائی تکلیف معلوم ہونے لگی مگر مسلسل آلام و پیہم مصیبتیں سہتے سہتے وہ اُن سے مانوس ہوگئی۔ گاہے اس نے خیال کیا کہ کسی اچھے کا سہارا لیکر زندگی بسر کرے یا خودکشی کرلے لیکن دھرمو کے ملنے کی آس نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ ہمیشہ مغموم وملول رہنے سے اس کا زہد فریب حسن لٹ گیا۔ آتشین رخسار جھلس گئے۔ جسم کا گداز آلام حیات کی نذر ہوگیا۔ شوخی کی جگہ اداسی نے لے لی۔ عمر خیام کی رباعیوں کی ترجمانی کرنے والی آنکھیں ویران ہوگئیں۔ غرض ہنسلی وہ ہنسلی نہ رہی جو دو سال پیشتر کی سردیوں میں تھی ۔

دو سال جیسا طویل اور حوصلہ شکن زمانہ اس نے بڑے صبر والوالعزمی کے ساتھ کاٹا لیکن اُمید برآتی نہیں معلوم ہوئی آشاؤں کے پھول نہ کھل سکے۔ کمر ہمت ٹوٹ گئی اور بے چینیاں بڑھ گئیں۔ وہ دھرمو کی تلاش میں نکلی وہاں یہاں بہت جگہ ڈھونڈھ مارا مگر کوئی سراغ نہ لگا۔ ایک دن وہ اپنے طویل سفر سے واپس آرہی تھی اس نے سوچا تھا اب ڈھونڈھنے نہ جائیگی کیونکہ پیہم ناکامیوں نے اسے مایوس کردیا تھا۔ لیکن راستے میں گروہ کے گروہ آدمیوں کے کہیں جاتے پاکر وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئی ۔ آدمیوں کی رہروانہ مستعدی ان کے چہروں پر رقص کرتی ہوئی مسرت ان کے زرق برق کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی خاص مقام پر جا رہے ہیں

" تو کیوں مغموم ہے " ہنسلی کے دل نے کہا وہ کلیجہ تھام کر اپنے ننھے سے لخت جگر کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئی۔ نہ جانے آج اس کا دل کیوں بھر آرہا تھا۔ آج اس پر ایک نئی کیفیت طاری تھی جسے وہ خود نہ سمجھ سکی۔ آدمیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا بہت دیر بعد اس کا جی چاہا کہ پوچھوں تو سہی یہ لوگ جا کہاں رہے ہیں اس نے پوچھا " کہاں جا رہے ہیں "۔

" کہاں ؟ ایک ننھی سی لڑکی آنکھیں مٹکا کر بولی " نہیں جانتی !!

" نہیں تو بابا " ہنسلی نے جواب دیا ۔

لڑکیاں ہنسنے لگیں شاید اس کی معصومیت پر۔

آخر ایک بڑھیا نے جواب دیا " جاترا چلیں ہیں جاترا !! "

" جاترا ! کس کی ؟ کتنی دور ہے یہاں سے ؟؟ " اس کے دل میں سوال پیدا ہوا معاً اسے خیال آیا کہ دھرمو بھی ایک دفعہ ایسے ہی گیا تھا۔ وہ جاترا دیکھنے کا بڑا شوقین تھا ممکن ہے وہ یہاں آجائے اور میں اپنی تمناؤں اور اُمیدوں کے مرکز کو پا جاؤں اس خیال کے ساتھ ہی وہ اُٹھی اور ایک گروہ کے ساتھ ہولی۔

"کتنی دور ہے دادا یہاں سے ؟" اس نے ایک بوڑھے سے استفسار کیا۔

"دس کوس ہے دس کوس" جواب ملا۔

"دس کوس" اس کا دل دہشت سے بیٹھ گیا۔

کمزور تو پہلے ہی کچھ دن سے کافی غذا نہ ملنے کے باعث نقاہت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لیکن شوق و امید کے سامنے ہزاروں کمزوریاں اپنا سر جھکاتی ہیں وہ ہمت سے قدم بڑھانے لگی۔ سارے دن کی دھوپ میں تپنے کے بعد شام کے دھندلکے میں دور دیوی کے ہاں جلنے والے دیئے اور دکانوں کی برقی روشنی نظر آنے لگی۔ ہر شخص کے دل کو ڈھارس بندھ گئی۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کب پہنچیں کب نہیں جو یہاں پہنچتے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لیتے پھر دیوی کے درشن کرنے والے دیوی کے درشن کرتے اور گھومنے والے گھومتے غرض ہر شخص اپنا اپنا راستہ اختیار کر لیتا۔ ہنسلی بھی آئی ہر طرف چہل پہل اور پھیلی ہوئی مسرت دیکھ کر وہ بھی کچھ دیر کے لئے خوش تو ضرور ہوئی لیکن جب اپنی بے سروسامانی کا احساس ہوا تو اداس ہو گئی کوئیں پر جا کر پانی پیا اپنے اور بچے کے گرد آلود چہرے کو صاف کیا تھوڑی دیر سستانے کیلئے بیٹھ گئی لڑکا بجلی کی روشنی میں ہاتھ پیر ہلا کر کھیلنے لگا دکانوں کا منظر برقی روشنی میں دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔ ہنسلی کا دل دھرمو کے خیال ہی سے دھک دھک کر رہا تھا آنکھوں میں عہد ماضی کے برباد مگر وجد آگین افسانے پھرنے لگے۔ وہ آنسو بہانے لگی یہاں تک کہ اس کی سسکیاں بندھ گئیں۔ کون پوچھتا کہ "کیوں رو رہی ہے" آخر کار خود ہی اسے اپنی حالت کا احساس ہوا آنکھیں اوڑھنی سے پونچھ ڈالیں اور آدمیوں کے ہجوم میں بچہ کھلونوں اور عجیب عجیب چیزوں کو دیکھ کر اچھلنے لگا۔

ہنسلی کی نگاہیں ہر آدمی کی آڑ میں دھرمو کو پیش کر رہی تھیں وہ بے مقصد گھوم رہی تھی اب تک ہر دکان کے سامنے سے چار چار بار گذر چکی تھی تھوڑی دیر بعد پھر گھومنے لگی بچہ سو گیا اور جاگا ہنسلی کے کانوں میں آواز آئی "میں کل شام پڑتے آؤں گا" معاً اس نے پلٹ کر دیکھا کسی نہ معلوم قوت نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا۔ آواز دھرمو کی آواز سے مشابہت رکھتی ضرور تھی۔ لیکن لہجہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ پی گیا ہے۔ لڑکا ہنسلی کی گود میں اچھلنے لگا ہنسلی نے لڑکے کو چپ کرنے کی خاطر ذرا کرخت لہجے میں "چپ" کہا دھرمو بھی غیر ارادی طور پر مڑ گیا۔ وہ بہت کچھ بدل گیا تھا سر میں زلفین رکھ چھوڑی تھیں۔ کچھ اتر بھی گیا تھا۔ داڑھی بھی بڑی ہوئی تھی آنکھیں نشہ میں چور تھیں۔ ہنسلی نہ پہچان سکی اور دھرمو کو بھی یقین نہیں آیا کہ یہ ہنسلی ہے کیونکہ ہنسلی کے پچکے ہوئے رخسار نکلی ہوئی ہڈیاں۔ پھر خیال ہوا کہ "دھرمو سے مشابہت تو رکھتا ہے۔ پوچھوں تو سہی کون ہے" وہ مڑی دھرمو اس کی طرف دیکھ رہا تھا اسے یقین ہو گیا کہ یہ ہنسلی ہی ہے۔ لیکن یہ بچہ کس کا ہے ؟ یہ حالت کیسی ؟؟ ممکن ہے اس کی شادی ہو گئی ہو" اس کا خمار اتر گیا۔ ہنسلی کو اب بھی

یقین نہیں آیا کہ یہ دھرمو ہے وہ دھرمو پر نگاہیں جمائے کھڑی تھی کہ اس نے آگے بڑھ کر دھڑکتے ہوئے دل سے "ہنسلی" کہا ہنسلی نے بھی دو گرم آنسو ٹپکا کر "دھرمو" کہا۔ ہجوم میں وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ دھرمو نے کچھ کھانے کے لئے خرید لیا اور وہ باہر آ کر بیٹھ گئے۔

"لو ہنسلی! کھاؤ ــــــ اچھی تو ہو نا" دھرمو نے کہا۔

"ہاں!" اس نے ایک سرد آہ کے بعد کہا۔

"اچھا کیا جو تم نے اپنا جوڑا ڈھونڈ لیا" دھرمو نے کہا

ہنسلی نے چونک کر کہا "کیسا جوڑا؟"

"یہی ــــــ تمہارا بیاہ ہو گیا ہے نا؟" دھرمو نے پوچھا

"بیاہ؟" ہنسلی نے کہا "ہاں۔ ہو گیا ہے" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کتنے دن ہوئے" دھرمو نے پوچھا

"بہت ــــــ!" اس نے ذرا آواز کو باریک کر کے کہا

"بچہ۔ سندر تو ہے ہنسلی!"

"ہاں!" ہنسلی نے کہا "ہوگا"

کچھ دیر تک دھرمو کے چہرے کو خاموشی دیکھتا رہا۔ ہنسلی کے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"کھاتی کیوں نہیں ہنسلی" دھرمو نے پوچھا "تم تو رو رہی ہو"

"نہیں تو" ہنسلی نے اوڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ اتر بھی گئی ہو" دھرمو نے ہنسلی پر نگاہیں جما کر کہا "کیا بات ہے ہنسلی!"

"بہت سکھ ہے"

"سکھ ہے!" اس نے ہنسلی کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سکھ سے تو آدمی موٹا ہوتا ہے"

"اور تم کس لئے اتر گئے ہو؟" ہنسلی نے پوچھا

"میں ــــــ!" دھرمو نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میں اترا نہیں ہنسلی"

دھرمو کا لہجہ ماتم انگیز تھا ہنسلی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔

دھرمو نے پوچھا "کب جاؤ گی ہنسلی! یہاں سے؟"

"کب ــــــ؟ تم ہی بتاؤ کب جاؤں؟" ہنسلی نے سوال کیا

"کل یہیں رہو گی نا؟"

"ہاں" ہنسلی نے جواب دیا۔
دھرمو نے اُٹھتے ہوئے کہا "اچھا میں تم سے صبح ملوں گا۔ یہاں میرے سنگی ہیں ان کے پاس بیٹھتا ہوں"
دھرمو کو بھولی ہوئی کہانیاں یاد آرہی تھیں کہنے کو تو کہہ دیا کہ وہ جائے گا لیکن دل نہ چاہتا تھا قدم ڈگمگا رہے تھے وہ تھوڑی دور بھی نہ گیا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا ٹھیک اس وقت ہنسلی نے "دھرمو" کہکر پکارا۔ ہنسلی رو رہی تھی۔ دھرمو آیا ہنسلی کے آنسو دیکھ کر عجیب عجیب خیالات اور پریشانیوں میں اُلجھ گیا۔
"کیا بات ہے ہنسلی"؟ اس نے دریافت کیا۔
"کچھ نہیں!" ہنسلی نے جواب دیا۔
"پھر یہہ رونا کیسا"!
"دھرمو!" ہنسلی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "میں ابھی جا رہی ہوں شاید تم سے نہ مل سکوں"۔
"کوئی اور تمہارے ساتھ ہے؟" دھرمو نے پوچھا۔
"میرے ساتھ۔ کوئی نہیں"
"یہہ لو" دھرمو نے ایک روپیہ دیتے ہوئے کہا "اسے رکھ لو"
"نہ نہ نہ —— یہہ کیا کروں" ہنسلی نے کہا۔
"مگر یہ نہ سمجھ سکا تم رو کیوں رہی ہو؟" دھرمو نے کچھ تفکر آمیز لہجے میں پوچھا "معلوم ہوتا ہے پتی سے روٹھ کر نکلی ہو"۔
"دھرمو!۔ میرا پتی کہاں جو روٹھ کر نکلوں" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"کیا وہ مر گیا"؟ دھرمو نے تعجب سے پوچھا
"نہیں"!
"تم کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو ہنسلی" دھرمو کا لہجہ قدرے ترش تھا۔
"ہاں"! ہنسلی نے یاس انگیز لہجے میں کہا "میں بہکی بہکی باتیں کرتی ہوں"
"پھر تمہارے پتی کو ہوا کیا" دھرمو نے پوچھا۔
"پتی کہاں کا؟ کس کا پتی؟؟" ہنسلی نے کہا
"پھر یہ بچہ؟؟" دھرمو نے حیرت سے دریافت کیا۔
"ہمارے پاپ کا پھل" ہنسلی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
"ہمارے پاپ کا پھل!" دھرمو نے دُہراتے ہوئے کہا "تو کیا اب تک تم بیاہی نہیں گئیں؟"

بچہ انتہائی انہماک سے دونوں کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی معصومیت نہ معلوم اسے کیا سمجھا رہی تھی۔ ننھا بچہ مسرور فرشتہ۔

"ہوں ۔ ۔ ۔" ہنسلی نے صرف اتنا ہی کہا اور دور کہیں دیکھنے لگی ۔

"ہنسلی !" دھرمو نے ملتجیانہ انداز میں کہا "میں نے بڑا دوش کیا"

"نہیں تو ۔۔۔ تمہارا کوئی دوش نہیں" ہنسلی نے کہا "دوش ہم دونوں کا ہے"

"تم اتنے دن کہاں رہیں ہنسلی" ؟ دھرمو کا لہجہ نرم تھا ۔

"کہاں رہتی" ہنسلی نے طنزاً کہا "تمہاری طرح بھاگ تو نہیں سکتی تھی"

"تمہیں میری طرف سے بہت دکھ تو ہوا ہنسلی" دھرمو نے کہا

"بہت" ہنسلی نے مذاقاً "اچھا ۔۔۔۔۔ ! دھرمو ! میں اب جاتی ہوں"

"کہاں جاؤ گی" دھرمو نے ہنسلی کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا ۔

"نہیں جانتے" ؟ ہنسلی نے منہ بنا کر کہا "اپنے پتی کے ہاں"

"پتی کے ہاں !" دھرمو نے ہنسلی کا رخسار چٹکتے ہوئے کہا۔

"ہٹو !" ہنسلی نے اپنے دلفریب انداز میں کہا "تم بڑے وہ ہو۔"

اور افق پر چاند مسرت و سکون کے پھول ان پر نچھاور کر رہا تھا کوئی پنچھی میٹھے بول بول رہا تھا ۔۔۔

ساحر دیہاتی (عثمانیہ)

نعرۂ عشق

لائق ہمدانی لدھیانوی

(۱) پہلو میں دِل ہے دِل میں تب و تابِ عشق ہے

آنسو نہیں یہ آنکھ میں سیلابِ عشق ہے

(۲) ہشیار! اے سفینۂ ہستی کے ناخدا

پھر دِل کی سمت اب رُخ گردابِ عشق ہے

(۳) دیکھا سگِ حبیب تو اُٹھ کر لیئے قدم

دیوانہ اُن کا واقفِ آدابِ عشق ہے

اکسیرِ عشق چاہیئے تو عاشقوں سے ڈھونڈھ

اِن گل رخوں کے پاس تو سیمابِ عشق ہے

اب بندگی میں لُطف ہی کچھ اور آئے گا

سر ہے جنونِ سجدہ ہے محرابِ عشق ہے

تقاریب کی خوشی کو دوبالا کرنے کیلئے
سونے
چاندی
ہیرے
جواہرات
کے زیورات
یہاں سے خرید فرمائیے
محمد عثمان جوہری
عابد روڈ حیدرآباد دکن
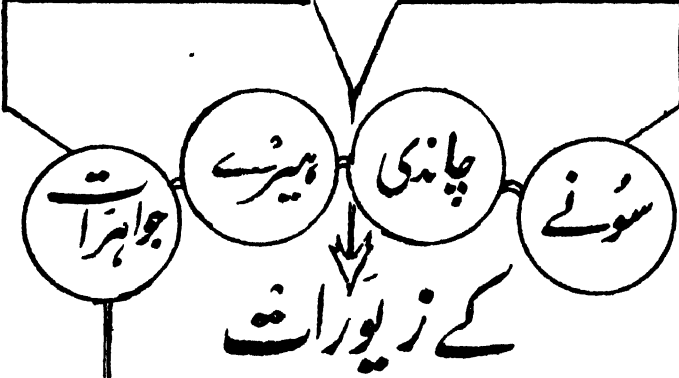
ڈرامہ

گل اور پتنگ

نصیر۔ بھائی خاموش رہو۔

جمیل۔ کیوں ؟

نصیر۔ اچھا پہلے باتیں کر لو۔

جمیل۔ اتنی دیر ہو گئی۔

نصیر۔ تو کیا ہوا۔

جمیل۔ ابھی تک کوئی مچھلی نہیں آئی ؟

نصیر۔ باتیں بناؤ، ضرور آئے گی۔

جمیل۔ اچھا اب تم گل ڈالو۔

نصیر۔ نہیں پہلے باتیں کر لو۔

جمیل۔ آخر کیوں نہیں ڈالتے ؟

نصیر۔ صبح ہو جائے گی۔ مگر . .

جمیل۔ یہ اگر مگر کیا کہہ رہے ہو۔

نصیر۔ مچھلی ہرگز نہ آئے گی۔

جمیل۔ کیوں ؟

نصیر۔ آواز سن کر۔

جمیل۔ تو کیا پانی میں بھی آواز جاتی ہے۔

نصیر۔ اور نہیں تو کیا۔ اچھا خاموش !

جمیل۔ اگر مچھلی پھنس گئی تو۔ . . .

نصیر۔ تو کیا ؟

جمیل۔ ایک بات ہے۔

نصیر۔ بتاؤ نا۔

جمیل۔ نہیں۔

نصیر۔ میں سب جانتا ہوں۔

جمیل۔ کیا جانتے ہو ؟

نصیر۔ کسی پر۔ . . (رکتا ہے)

جمیل۔ کسی پر کیا ؟ کہو۔

نصیر۔ بگڑو گے تو نہیں۔

جمیل۔ کیا بولو۔

نصیر۔ کیا ڈورے ڈال رہے ہو۔ ؟

جمیل۔ ہاں۔

نصیر۔ وہ کون ہے ؟

جمیل۔ ابھی نہیں بتاتا۔

نصیر۔ بتاؤ نا بھائی۔

جمیل۔ نہیں ابھی نہیں

نصیر۔ تمہیں میری قسم بتاؤ

جمیل۔ تو قسم کیوں دیتا ہے۔

نصیر۔ تو پھر بتاؤ۔

جمیل۔ برابر والی۔ بنیہ

نصیر۔ اُو۔ تو وہ میری بھابی ہے۔

جمیل۔ کیا بکتے ہو۔

نصیر۔ تم ہی نے تو کہا۔

جمیل۔ اچھا خاموش رہو۔

(گل ڈالتے ہیں)

(کچھ دیر بعد)

نصیر۔ میری گل بھاری ہو گئی ہے۔
جمیل۔ تو کھینچوا سے۔
نصیر۔ اب مٹھائی کھلاؤ۔
جمیل۔ کیوں؟
نصیر۔ یہ ثبوت ہے۔
جمیل۔ کاہے کا؟
نصیر۔ رضیہ بھابی بنے گی۔
جمیل۔ اچھا کھلا دوں گا۔
نصیر۔ کھلا دوں گا نہیں ابھی چلو۔
جمیل۔ ارے پہلے شادی تو ہونے دو۔
نصیر۔ بس ہو گئی۔ لاؤ مٹھائی۔
جمیل۔ کیا تیرے نزدیک۔
نصیر۔ ہاں اور تمہارے نزدیک۔
جمیل۔ میرے تو خواب میں ہوئی۔
نصیر۔ تو آپ ایسے بھی خواب دیکھا کرتے ہیں۔
جمیل۔ ہاں۔
نصیر۔ خواب میں کیسے؟
جمیل۔ اچھا چل اب۔
نصیر۔ نہیں پہلے بتاؤ۔
جمیل۔ میں بحث نہیں کر رہا۔
نصیر۔ نہیں بتانا ہو گا۔
جمیل۔ چلو اب چل کر۔
نصیر۔ کیا چل کر بتاؤ گے۔
جمیل۔ نہیں۔
نصیر۔ تو پھر کیا کرو گے۔
جمیل۔ پتنگ اڑائیں گے۔
نصیر۔ خیر چلو۔
جمیل۔ تم بازار سے لے آؤ۔
نصیر۔ اچھا۔ وہ بھی تو اڑاتی ہیں۔
جمیل۔ ہاں انہی سے لڑائیں گے۔
نصیر۔ مزیدار جنگ رہے گی۔
جمیل۔ جا لے آ۔
نصیر۔ سب سے خراب مانجھ لاؤں گا۔
جمیل۔ کیوں۔
نصیر۔ میں بھابی کو نہ ہارنے دوں گا۔
جمیل۔ ارے واہ اس سے کیا فائدہ۔
نصیر۔ فائدہ ہو یا نقصان
جمیل۔ اس سے تجھے کیا ملے گا۔
نصیر۔ مجھے ایک چیز ملے گی۔
جمیل۔ کیا چیز ملے گی۔
نصیر۔ یہ نہ بتاؤں گا۔
جمیل۔ بتانا ہو گا۔
نصیر۔ کیوں بتاؤں۔
جمیل۔ میں نے تو اپنے پورے راز بتا دیئے۔
نصیر۔ لیکن ایک چھپا رکھے ہو۔
جمیل۔ بتاتا ہے یا نہیں۔
نصیر۔ تم پہلے وہ بات بتاؤ۔
جمیل۔ اچھا تو تیری یہ چال ہے۔

نصیر۔ جی۔ اب بتاؤ گے یا نہیں۔
جمیل۔ سن۔ میں نے اس سے۔ ۔ ۔ ۔
نصیر۔ کیا کہا۔
جمیل۔ شادی کرلی۔
نصیر۔ چپ چاپ۔ ہمیں خبر بھی نہ کی۔
جمیل۔ ہاں۔
نصیر۔ مگر برات وغیرہ کہاں آئی۔
جمیل۔ کچھ بھی نہیں۔
نصیر۔ تو وہ ایسی کیسی شادی تھی۔
جمیل۔ سیول میرج۔
نصیر۔ اچھا تو اب آپ۔ ۔ ۔
جمیل۔ کیا۔
نصیر۔ انگریز بھی بن گئے۔
جمیل۔ اباسے نہ کہنا۔
نصیر۔ لیکن اماں سے تو کہوں گا۔
جمیل۔ ارے دونوں سے نہیں۔
نصیر۔ ارے واہ ایک سے تو کہنا ہی ہوگا۔
جمیل۔ نہیں۔
نصیر۔ نہیں کیوں؟ بعد میں۔
جمیل۔ بعد میں کیا ہوگا۔
نصیر۔ اصلی نکاح ہوجائے گا۔
جمیل۔ لیکن گالیاں جو پڑیں گی۔
نصیر۔ کیا ہوا سُن کر ٹال دینا۔
جمیل۔ واہ۔
نصیر۔ اچھا تم ایک لفظ بھی نہ کہنا۔

جمیل۔ کیوں۔
نصیر۔ نہیں تو انہیں غصہ آجائے گا۔
جمیل۔ ہاں ٹھیک ہے۔
نصیر۔ ارے پتنگ
جمیل۔ آخر تو نہیں گیا۔
نصیر۔ پیسے نوکر کو دیئے ہیں۔
جمیل۔ پھر ابھی تک کیوں نہیں آیا۔
نصیر۔ آتا ہی ہوگا۔
جمیل۔ لو۔ وہ آرہا ہے۔
نصیر۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔
جمیل۔ کہاں۔
نصیر۔ بھابی کے پاس۔
جمیل۔ ہاں جاؤ جلد آؤ۔
نصیر۔ اچھا۔ (جاتا ہے)

(رضیہ کا مکان)

نصیر۔ آپا۔ (پکارتا ہے)
رضیہ۔ کیا ہے نصیر۔
نصیر۔ یہاں آؤ۔ آپا۔
رضیہ۔ تمہارے بھائی کہاں ہیں۔
نصیر۔ گھر میں ہیں۔
رضیہ۔ کیا کر رہے ہیں۔
نصیر۔ تم پتنگ اُڑاؤ آپا۔
رضیہ۔ کیوں؟
نصیر۔ بھائی سے لڑاؤ۔
رضیہ۔ کیا آج وہ اُڑا رہے ہیں۔

نصیر ۔ ہاں ۔
رضیہ ۔ اچھا اڑاتی ہوں ۔
نصیر ۔ ایک بات پوچھوں ۔
رضیہ ۔ کیا ؟
نصیر ۔ بُرا تو نہ مانوگی ۔
رضیہ ۔ ارے نہیں بول ۔
نصیر ۔ کیا تمہاری شادی ہوگئی ۔
رضیہ ۔ نہیں تو ۔ کیوں ۔
نصیر ۔ تم جھوٹ بولتی ہو ۔
رضیہ ۔ جھوٹ بولنے سے فائدہ ۔
نصیر ۔ تم نے سیول میرج نہیں کی ۔
رضیہ ۔ تجھے کیسے معلوم ہوا ۔
نصیر ۔ مجھ سے نہیں چھپا سکتیں ۔
رضیہ ۔ آخر تجھ سے کہا کس نے
نصیر ۔ بھائی نے کہا ۔
رضیہ ۔ بہت خراب ہیں تیرے بھائی ۔
نصیر ۔ کیوں ؟
رضیہ ۔ پیٹ کے ہلکے ہیں ۔
نصیر ۔ اچھا ہی ہوا نا جو کہدیا ۔
رضیہ ۔ اچھا کیا ہوا ۔
نصیر ۔ میں نے امی سے کہہ دیا ہے ۔
رضیہ ۔ کیا وہ بگڑیں ۔
نصیر ۔ ہاں بہت بگڑیں ۔
رضیہ ۔ برا ہوا ۔
نصیر ۔ اچھا ہوا ۔ فروری کا مہینہ ۔ ۔ ۔

رضیہ ۔ یہہ کیا ۔
نصیر ۔ تمہاری اور بھائی کی شادی ۔
رضیہ ۔ اچھا تو آ میرے ساتھ ۔
نصیر ۔ کیوں ؟
رضیہ ۔ تیرا منہ میٹھا کروں ۔
نصیر ۔ بھابی پہلے پتنگ تو اڑاؤ ۔
رضیہ ۔ تو پہلے آ تو سہی ۔
(دونوں اندر جاتے ہیں)
رضیہ ۔ یہ لے یہہ لڈو کھالے ۔
نصیر ۔ بھابی یہہ تو بڑے مزیدار ہیں ۔
رضیہ ۔ تو نے ابھی سے بھابی بنا لیا ۔
نصیر ۔ اور نہیں تو کیا ۔
رضیہ ۔ ارے واہ
نصیر ۔ واہ کیا آخر یا اول
رضیہ ۔ کوئی سُنے گا تو خیر نہیں ۔
نصیر ۔ کیا ہوگا ۔
رضیہ ۔ ہوگا تو کچھ نہیں ۔
نصیر ۔ اچھا تو اب جاتا ہوں ۔
رضیہ ۔ اچھا جاؤ ۔
(جاتے ہوئے زور سے کہتا ہے)
نصیر ۔ اداب بھابی
رضیہ ۔ شریر کہیں کا ۔
نصیر ۔ بھابی ۔ اڑا رہی ہیں ۔
جمیل ۔ دیکھ وہ اڑی
نصیر ۔ ہاں

جمیل۔ تونے کہا نہیں کیا چیز ملے گی۔
نصیر۔ سنو۔ ابھی سی بھابی ملے گی۔
جمیل۔ خیر جب ملے گی۔ جب ملے گی۔ ابھی تو نہیں۔
نصیر۔ ملے گی ضرور ملے گی۔
جمیل۔ ابھی تو امی سے بھی کہنا ہے
نصیر۔ کہدیا۔
جمیل۔ کیا کہا؟
نصیر۔ خفا ہو رہی تھیں۔
جمیل۔ بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔
نصیر۔ کیوں۔؟
جمیل۔ تونے انہیں ناراض کر دیا۔
نصیر۔ اور ساتھ ہی راضی کر لیا۔
جمیل۔ آج تجھے مٹھائی کھلاؤں گا۔
نصیر۔ مہینہ اور دن بھی مقرر ہو گیا۔
جمیل۔ کب؟
نصیر۔ فروری کی اکیس تاریخ

جمیل۔ تونے تو کمال کر دیا۔
نصیر۔ میں نے بھابی سے بھی کہہ دیا۔
جمیل۔ اچھا کیا۔
نصیر۔ صرف ایک ہفتہ باقی ہے
جمیل۔ ہاں۔
نصیر۔ گل اور پتنگ۔
جمیل۔ یہہ کیا۔
نصیر۔ یہ دن یاد رہے گا۔
جمیل۔ کیوں ؟
نصیر۔ تمہیں کبھی کبھی یاد دلایا کروں گا۔
جمیل۔ اچھا۔
نصیر۔ اب شام ہو گئی ہے چلو۔
جمیل۔ ہاں چلو۔
نصیر۔ گل اور پتنگ۔

(ہنستے ہوئے جاتے ہیں)

مرزا صدیق بیگ قیس

قطعات

(۱)
اُن مست مست آنکھوں کا کیا پوچھنا ندیم
ساغر چھلک رہے تھے کسی کی نگاہ سے
ہم کیا بتائیں اپنے مقدر کا حال اب
وابستہ ہو گئے ہیں اُسی بارگاہ سے

(۲)
بیقرار ہی رنج و غم اُن کا ملال
یوں اجڑتا جا رہا ہے دل کا باغ
ہنس رہا ہوں پھر بھی ایسے وقت میں
زیست کا طوفان کی زد میں ہے چراغ

خیرات تانڈوی

ایک ناتمام نظم۔

رفیقۂ حیات سے

از صابر کوسگوی

مقدر نے تجھے باندھا ہے میرے ساتھ اے ہمدم ... محبت کی کشش نے دو دلوں کو کر دیا باہم
میری الفت کی یہ تاثیر تھی یا کوشش پیہم ... محبت کا تیری افسانہ تھا ورد زبان ہمدم

خدا کا شکر ہے۔ تشریف لا کر زینتیں بخشیں
زہے تقدیر۔ میری زندگی کو رفعتیں بخشیں

میرے غمخانۂ دل میں خوشی کے گیت گاؤ تم ... میری تاریک دنیا میں ہمیشہ مسکراؤ تم
محبت کے فسانے آنکھوں آنکھوں سے سناؤ تم ... میرے ہمراہ ساز دل پہ اکثر گنگناؤ تم

لب نازک کو جنبش دو نگاہیں چار ہونے دو
نیاز و ناز کی سرگوشیاں سرکار ہونے دو

تمہارے حسن کے جلوؤں میں کھو جائے میری ہستی ... فضائے حسن سے معمور ہو جذبات کی بستی
میری آنکھوں میں بھر دو چشم مستانہ کی سی مستی ... محبت قیمتی شئے ہے مگر مجھ کو ملی سستی

تم آئیں میرے غم خانہ میں سورج کی کرن بن کر
ہوئی جلوؤں کی بارش میرے اس حسرت زدے دل پر

خدا کا شکر ہے اب زندگانی عیش ساماں ہے ... میری آنکھوں سے مرا جذبۂ باطن نمایاں ہے
تمہارا حسن رنگیں اب میری نظموں کا عنواں ہے ... میرے قلب و جگر کے گوشے گوشے میں گلستاں ہے

میرے دل کی تمنا زندگی کی آرزو تم ہو
بہار زندگی ہو۔ گلستاں کا رنگ و بو تم ہو

چلو آؤ بسائیں۔ اک نئی دنیا حقیقت کی ... جہاں میں ڈالدیں بنیادیں پاکیزہ محبت کی
جہاں پرستیاں ہی ستیاں ہیں حسن و الفت کی ... وہاں چھیڑیں گے اپنی دھن میں ہمدم نغمے مسرت کی

جہاں کو شعر و نغمے کے اثر سے مست کر دیں گے
تبسم خیز جلوؤں سے گلوں میں رنگ بھر دیں گے

حیات نو کی کشتی ڈگمگائیگی نہ طوفاں ہیں خزاں کے تند جھونکے اب نہ آئیں گے گلستاں میں
نئی اک رُوح پھونکیں گے محبت قلب بیجاں میں سرور کیف پیدا ہوں گے جذبات پریشاں میں
ہماری زیست کا مقصد نشاط و کامرانی ہے
ہماری زندگی کیا ہے ۔ جوانی ہی جوانی ہے
یہ پچھلی رات کا منظر جو چاندنی راتیں سُریلے قہقہے پر کیف نغمے پیار کی باتیں ۔
عرق آلود عارض سُرخ ہونٹوں سے مداراتیں ستاروں نے بھی زیر آب آکر کیں ملاقاتیں ۔
ہمیں مل جُل کے بحرِ زیست میں کشتی کو کھینا ہے
جہاں میں سرمدی الفت کا اک پیغام دینا ہے

ایلورہ اجنٹہ

کی سیر کرنیوالے حضرات اکثر فرحت رسٹورنٹ میں قیام کرتے ہیں، اُنہیں کھانا عمدہ ملتا ہے ۔ رہنے کے لئے بہترین انتظام ہے ۔
مسافرین کو پورا سکون ملتا ہے ۔
اس کے باوجود کرایہ بہت ہی کم ہے ۔ کھانے کے اخراجات وہی ہوتے ہیں جو آپ روزمرہ اپنے گھر میں کیا کرتے ہیں ۔ نیز جہاں آپ جانا چاہیں ۔
موٹر بس بالکل رسٹورنٹ کے سامنے ہی ٹھہرتی ہے ۔

فرحت رسٹورنٹ

چوک بازار اورنگ آباد
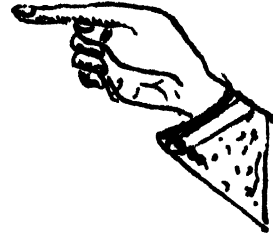
سیلانہ
سیلان الرحم
یعنے
عورتوں کے سفید پانی بہنے کی
وہ بے نظیر دوا جو مرض کو دور کرنے کے علاوہ عورت کی صحت اور حسن کو بھی چار چاند لگا دیتی ہے۔
سیلان الرحم (سفید پلو) نہایت نامراد مرض ہے جو عورتوں کا خون پیاسی جونک کی طرح چوس لیتا ہے۔ سیلان الرحم میں مبتلا ہونے کے بعد عورت کے حسن و جمال کی دوپہر ڈھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ چہرے کی آب و تاب جاتی رہتی۔ بدن ٹوٹنے لگتا ہے کمر درد کے مارے سیدھی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح جریان مردوں کو نامرد بنا دیتا ہے اسی طرح سیلان الرحم کی کثرت عورتوں کو ناعورت بنا دیتی ہے سیلان الرحم کی شکایت میں مبتلا عورت کو مباشرت میں لذت حاصل نہیں ہوتی بلکہ اکثر حالات میں وہ مباشرت کے نام سے بھی بیزار رہا کرتی ہے۔ ایسی عورتیں بھی دیکھی گئی ہیں جو سیلان الرحم کی وجہ سے مباشرت میں ازحد تکلیف محسوس کرتی ہیں علاوہ ازیں سیلان کی مریضہ عورتوں کی گود بھی اکثر خالی رہی۔ مشاہدات شاہد ہیں کہ آج کل نوّے فیصدی عورتیں سیلان الرحم میں مبتلا رہ کر اپنی صحت۔ جوانی اور حسن کا ستیاناس کر رہی ہیں مگر شرم و حیا کے مارے اپنے شوہر تک کو اپنی اس خفیہ شکایت سے ناواقف رکھتی ہیں عقلمند شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی سے اس مرض کے بارے میں اکثر دریافت کرتا رہے اگر کسی عورت کا حسن و جمال بغیر کسی خاص وجہ کے روبہ زوال نظر آئے۔ اس کے چہرے کی آب و تاب جاتی رہے جو چند ماہ پیشتر تھی تو یقین کر لیجئے کہ وہ سیلان الرحم میں مبتلا ہو گئی ہے اس خطرناک مرض کے دفعیہ کی فوری تدابیر کیجئے ورنہ بہت جلد ایک نو دا اب پھول اپنی شگفتگی ... خزاں رسیدہ شاخ کی طرح پژمردہ اور مضمحل ہو جائے گی سیلانہ سیلان الرحم کی اکسیری دوا ہے جس کی صرف چند خوراکوں سے مرض دور ہو جاتا ہے معدہ میں ہضم کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے بھوک کھل کر لگنے لگتی ہے۔ لٹا ہوا جوبن ... مرجھائے ہوئے چہرے میں آب و تاب پیدا ہونے شروع ہو جاتی ہے۔ ... اس نسخہ کا خاص جزو ہیں۔ قیمت (۳۰) گولی تین روپیہ محصول ڈاک علاوہ
ملنے کا پتہ:۔ مینیجر جوہر فارمیسی غریب خانہ گوشہ محل حیدرآباد دکن

غزل

جناب اظہار ملیح آبادی ہمشیرزادہ حضرت جوشؔ

آجا کہ میری زیست ہے ویران تیرے بغیر
ہر ایک نفس ہے شعلہ بداماں تیرے بغیر

رونے میں لطف ہے نہ کچھ ہنسنے میں ہے مزا
سونے پڑے ہیں دشت و گلستاں تیرے بغیر

اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ نقاہت سے درد کے
ہوتا نہیں ہے چاک گریباں تیرے بغیر

للہ اب تو آ کہ تیرا انتظار خود
ہے زندگی سے دست و گریباں تیرے بغیر

چھپ چھپ کے شوق و شنگ ستارونکی آنکھ میں
روتا ہے ابر میں مہ تاباں تیرے بغیر

خودداریوں میں آگ برستی ہے صبح و شام
ہے زندگی پہ صحت کا احساں تیرے بغیر

بھیگی ہوئی شباب سے برکھا کی رات میں
ہے شمع آنسوؤں کی فروزاں تیرے بغیر

پگھلا دیا ہے دل کو محبت کی آنچ نے
ہر زخم بن گیا ہے اک ارماں تیرے بغیر

بدلا ہوا ہے خون محبت کا اشک میں
پھیکا ہے رنگ عالم امکاں تیرے بغیر

حسرت وہ آج تک جو تھی تجھ سے چھپی ہوئی
ہوتی ہے آنسوؤں میں نمایاں تیرے بغیر

اظہارؔ ابھی تیری ہی الفت میں نغمہ زن
کیا خاک اب کوئی ہے غزل خواں تیرے بغیر

"محارباتِ عالم اور جانی و مالی قربانیاں"
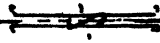
حضرتِ آدمؑ کی اولاد جس تناسب سے خاندانوں اور قبیلوں سے گذر کر مختلف قوموں کی شکل اختیار کر رہی تھی' اسی رفتار سے ان پیدا شدہ قوموں کے قلوب میں فسادات اور تفرقاتِ قلبی کے زہریلے جراثیم بتدریج نشوونما پا رہے تھے جو وقتاً فوقتاً بنی نوعِ انسانی کو جنگ و جدال پر اُبھار رہے تھے قوموں کا یہ پھیلاؤ ایثار و قربانی کے دائرہ کو لامتناہی وسعت دے رہا تھا۔ بالآخر تاریخِ عالم میں وہ پہلا ہولناک معرکہ وقوع پذیر ہوتا ہے جب کہ بنی اسرائیل کے دو عظیم گروہ آپس میں اس غضبناک انداز میں ٹکراتے ہیں کہ تختۂ زمین ہل جاتا ہے۔ چنانچہ خود خدائے عظمت و جلال اپنی مقدس کتاب میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ واضح کرتا ہے کہ "کس طرح ایک انسان کے قتل کو تمہاری ٹکر کا بہانہ بناتے تمہارے جمود و تعطل کو ہم نے نئی زندگی بخشی ۔"

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۔ کے معانی میں قدرت نے اسی فلسفہ کی تشریح عام کی ہے۔ تاریخِ عالم میں ایک قوم کے زوال کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس قوم کے خلاف شکست فاش اٹھانی پڑی اور جب کسی قوم کے عروج کی داستان دہرائی جاتی ہے تو اس قوم کے عروج کی تہ میں اس کی ظفرمندیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ گویا جدال و قتال' فتح و شکست درحقیقت تاریخِ عالم کے موروثی مصنفِ حقیقی کہلائے جا سکتے ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں' عدم تشدد کے ہزاروں مہاتماؤں اور امن کے لاکھوں دیوتاؤں نے ابتدائے آفرینش سے موجودہ دور تک جنگ و جدل کو ایک لعنت گردانتے ہوئے اس کا قلع قمع کرنے کی ان تھک کوششیں اپنے اپنے ادوار میں اپنی اپنی بساط کے موافق کیں۔ لیکن وہ پودا جس کی تخلیق اسرائیلوں کے لہو سے ہوئی تھی' وہ آج تک کروڑہا انسانوں کے لہو سے سینچا جا چکا ہے' اور شاید قیامت تک سینچا جائے۔ اور تاریخِ عالم جس کا سنگِ بنیاد اسرائیلیوں کی لاشوں پر فطرت نے گذرے ہوئے زمانہ میں رکھا تھا' آج ہزار ہا برس کے بعد وہ ایک پرشکوہ عمارت کی شکل میں ایستادہ ہے جس میں چونے اور اینٹوں کی بجائے دنیا کے نامور سلاطین' ایثار نفس تاجدار' جانباز سپاہ اور جاں سپار قائدین کا خون اور ان کی لاشیں استعمال کی گئی ہیں۔ اب اس مختصر سی تمہید کے بعد ان جنگوں کا حال درج کیا جاتا ہے جو جانی اور مالی قربانیوں کے لحاظ سے تاریخِ عالم میں نہایت اہم شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) کلنگ کی فتح کے لئے اشوک کو ایک لاکھ سپاہیوں کی قربانی دینی پڑی اور ۱½ لاکھ سپاہی یا تو زخمی ہوئے

یا گرفتار کر لئے گئے۔

(۲) جنگ جہلم:۔ جو سکندر اعظم اور راجہ پورس کے درمیان ہوئی تھی اس میں راجہ پورس کے ۳۵ ہزار سپاہی شریک تھے، جن میں سے ۲۱ ہزار سپاہی کام آئے اور سکندر اعظم کے ڈیڑھ ہزار سپاہیوں کا نقصان ہوا۔

(۳) عثمانی تاجدار سلیمان اول اور شاہ یونان کنٹاسورنس CANTASOZANUS کی افواج کے مابین جو معرکہ ۱۳۵۵ء میں ہوا اس میں طرفین کے تقریباً ۲ لاکھ افراد مارے گئے۔

(۴) ۱۳۸۹ء میں کوسو KOSOVE کے مقام پر ترکوں کے ۴ ہزار سپاہی اور عیسائیوں کے دو لاکھ لشکر جرار کی مدبھیڑ ہوئی اور اگرچہ کہ مراد اول کو فتح نصیب ہوئی لیکن طرفین کے ایک لاکھ سپاہیوں کا خاتمہ ہوا جس میں مراد اول بھی شامل ہے۔

(۵) ۱۴۵۳ء میں محمد ثانی نے قسطنطنیہ پر فوج کشی کی اور بازنطانی BYZANTINE EMPIRES حکومت کے خلاف کئی ماہ کے جنگ و جدال کے بعد اس وقت قسطنطنیہ فتح ہوا جب کہ طرفین کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار سپاہی میدان جنگ میں کھیت رہے۔

(۶) ۱۵۲۹ء میں سلیمان اعظم Suleman Magnificent اور فرانسس دوم Francis II اور چارلس پنجم Charles V کے مابین جو ہولناک ہنگامۂ جدال و قتال ہوا۔ اس میں ترکوں کو شکست اٹھانی پڑی ترکوں کے ۲۰ ہزار اور اتحادیوں کے ایک لاکھ ۲۵ ہزار سپاہی کام آئے۔

(۷) نپولین کے خلاف جو ۹ محاربات عظیم ہوئے ان میں مجموعی طور پر تقریباً ۲۲ لاکھ سپاہیوں نے حصہ لیا جن میں تقریباً چار لاکھ ہلاک ہوئے۔

(۸) جنگ ہائے انقلاب فرانس و نپولین میں ۲۱ ½ لاکھ سے زیادہ آدمی مارے گئے اور تقریباً ۱۰ مجروح یا زخمی ہوئے۔

(۹) پانی پت کی تیسری لڑائی میں (۱۷۶۱ء) احمد شاہ ابدالی کے خلاف تین لاکھ مرہٹہ فوجیں صف آرا تھیں ۱۳ گھنٹوں میں ۲ لاکھ مرہٹہ سپاہیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔

(۱۰) جنگ کریمیا CREMIAN WAR میں انگلستان، فرانس اور جرمنی کے تقریباً ۵ لاکھ سپاہیوں کا مجموعی طور پر نقصان ہوا۔ اس جنگ میں مالی نقصان مجموعی طور پر ۳۳ کروڑ پونڈ ہوا۔ جس میں برطانیہ عظمیٰ نے ۸ کروڑ پونڈ روس نے ۱۵ کروڑ پونڈ اور فرانس نے دس کروڑ پونڈ صرف کئے

(۱۱) لیپانٹو LAPNTO کی بحری جنگ میں ترکوں کے ۲۰ ہزار سپاہی چشم زدن میں مارے گئے۔

(۱۲) جنگ پننسولار PENINSULAR میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا مجموعی نقصان ایک لاکھ سپاہیوں کے لگ بھگ رہا۔ اور اس میں فرانس کے ۲۷ کروڑ پونڈ اور برطانیہ کے ایک ارب پونڈ صرف ہوئے۔

(۱۳) ممالک متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی جو چھ ماہ تک جاری رہی اس میں تقریباً ۴ لاکھ افراد کام آئے اور اس خانہ جنگی میں تقریباً ۱۴ لاکھ پونڈ پانی کی طرح بہانے پڑے۔

(۱۴) فرانسیسی جرمن جنگ FRANCOGERMON WARE جو ۷ ½ ماہ تک جاری رہی، اس میں طرفین کو تقریباً ۳۰ لاکھ سپاہیوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ۲۲ کروڑ پونڈ مجموعی طور پر صرف ہوئے۔ اور ۳۱ کروڑ پونڈ فرانس نے جرمنی کو بطور تاوان ادا کئے۔

(۱۵) ۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ میں تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ افراد مارے گئے اور ایک کروڑ ۵ لاکھ افراد بری طرح زخمی یا ناکارہ ہوئے۔ جن میں جرمنی کے ۲۲ لاکھ، روس کے ۲۱ لاکھ۔ فرانس کے ۱۵ لاکھ، آسٹریا اور ہنگری کے مجموعی طور پر ۱۳ لاکھ، ترکوں کے ۳ لاکھ، برطانیہ کے ۱۲ لاکھ، امریکہ اور اطالیہ کے ۹ لاکھ اور بقیہ ممالک کے تقریباً ۵ لاکھ افراد کی جانیں تلف ہوئیں۔ جرمنی کے تقریباً ۴۴ ½ لاکھ۔ برطانیہ کے ۲۲ لاکھ، آسٹریا کے ۲۸ ½ لاکھ، ہنگری اور فرانس کے تقریباً ۳۳ لاکھ، ترکوں کے ۸ لاکھ اطالیہ کے ۷ لاکھ اور امریکہ کے ۲ لاکھ اور دیگر ممالک کے تقریباً ۵ لاکھ افراد کی جانیں تلف ہوئیں۔ جرمنی کے تقریباً ۴۴ ½ لاکھ، برطانیہ کے ۲۲ لاکھ، آسٹریا کے ۲۸ ½ لاکھ، ہنگری اور فرانس کے تقریباً ۳۳ لاکھ، ترکوں کے ۸ لاکھ اطالیہ کے ۷ لاکھ اور امریکہ کے ۲ لاکھ اور دیگر ممالک کے تقریباً ۵ لاکھ افراد زخمی یا ناکارہ ہوئے۔

جنگی موازنہ۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں فرانس ۵۴ لاکھ پونڈ، جرمنی نے ۵۰ لاکھ پونڈ اور برطانیہ عظمیٰ ۲۷ لاکھ پونڈ یومیہ صرف کرتے رہے۔ اسی جنگ میں اتحادیوں کے مجموعی طور پر ۴۲ ارب پونڈ صرف ہوئے اور مخالف قوتوں نے ۳۰ ارب پونڈ صرف کئے۔ گذشتہ جنگ میں آسٹریلیا نے ۴۰ کروڑ پونڈ، ہندوستان نے ۹۹ کروڑ پونڈ، حیدرآباد نے ۵ کروڑ پونڈ، افریقہ نے ۵۰ کروڑ پونڈ جنگی امداد کے لئے برطانیہ کو دی تھیں۔ فرانس نے اس جنگ میں تقریباً ۱۰ ½ ارب پونڈ اور امریکہ نے ۹ ارب پونڈ صرف کئے تھے۔

(۱۶) روس اور جاپان کی مسلسل تین جنگوں میں (۱۹۰۴ء) طرفین کے تقریباً ایک لاکھ ۷۵ ہزار سپاہی ہلاک ہوئے فاتح جاپان رہا۔

(۱۷) روس اور عثمانی حکومت کے درمیان جو جنگ ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی اور جو کامل ایک سال تک جاری رہی اس میں فریقین کے تقریباً ۲ ½ لاکھ سپاہی مارے گئے۔

(۱۸) جنگ پلونہ PLOUNA میں ترکوں اور روسیوں کے جانی نقصانات مجموعی طور پر ۴۰ ہزار بتلائے جاتے ہیں۔

(۱۹) جنگ چین و جاپان جو ۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو شروع ہوئی اور اب بھی جاری ہے۔ ۱۹۴۱ء کے آخر تک چین کے ۱۰ لاکھ اور جاپان کے ۳ لاکھ سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

(۲۰) اسپین کے خانہ جنگی میں جنرل فرانکو FRONCO اور اللہ نسو کی فوجوں کا مجموعی طور پر ۹ لاکھ کا نقصان ہوا۔

(۱) موجودہ جنگ جو ستمبر ۱۹۳۹ء سے شروع ہے اس میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ اب تک تقریباً ایک کروڑ افراد مارے گئے اور اتنے ہی بُری طرح زخمی یا ناکارہ ہوئے۔ روس و جرمنی کی جنگ جو ۲۲ جون ۱۹۴۱ء سے شروع ہوئی اور جب کو آج کال ۹ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے۔ طرفین کے ہلوکین کی مجموعی تعداد ۳۰ لاکھ بتلائی جاتی ہے۔

اگر موجودہ جنگ عالمگیر میں ہلوکین کی تعداد ۱۰۰ فرض کی جائے تو ہلوکین کا تناسب ۵۰ فی صد عیسائی ۲۵ فی صد دنیا کی اور قومیں اور ۲۵ فی صدی مسلمان آتا ہے۔ اس حساب سے اگر ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء سے اوایل ۱۹۴۲ء تک ہلوکین اور مجروحین کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ نکالی جائے تو ہلوک و مجروح عیسائیوں کی تعداد ایک کروڑ مسلمان ۵۰ لاکھ اور دنیا کی تمام قوموں کے ہلوکین کی تعداد ۵۰ لاکھ کے لگ بھگ آتی ہے۔ ہلوک مسلمانوں کے مندرجہ اعداد سے ناظرین کو اچنبھا ہوگا لیکن غائر طور پر جنگ کے ۲½ سال پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ فرانس کی تباہی کے بعد اسلامی ممالک پر یا ان ممالک پر جہاں اسلامی آبادی اکثریت یا اقلیت کی صورت میں موجود ہے جنگ کے خوفناک بادل آسمان سے آگ اور خون برساتے رہے۔

پولینڈ، یونان، رومانیہ، یوگوسلویہ اور کریٹ میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یوکرین میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۳ کروڑ کے لگ بھگ ہے جن کو روسی زبان میں CASSACKS کہا جاتا ہے۔ کریمیا اسلامی جمہوریت ہے۔ اور اسی طرح روس کے مشرقی سرحد کے طویل دامن تک اسلامی آبادی موجود ہے۔ شمالی اور وسطی افریقہ میں کروڑہا مسلمان آباد ہیں جہاں آج کال دو سال سے مہیب جنگ ہو رہی ہے۔ لیبیا تونس اور اسی سلسلہ کے اور ممالک صد فی صد اسلامی آبادی رکھتے ہیں۔

عراق و ایران جہاں گذشتہ دنوں میں متعدد جھڑپیں ہوئی، اسلامی سلطنتیں ہیں۔ ملایا، سیام، سنگاپور، جاوا سماترا، بٹانگ، فلپائن اور دیگر جزائر شرق الہند و غرب الہند میں اسلامی آبادی کہیں اکثریت اور کہیں اقلیت میں ہے۔ اول الذکر ملک میں صد فی صد مسلمان آباد ہیں جو عربی النسل ہیں جہاں ۸ اسلامی ریاستیں جاپان کے اقدام تک موجود تھیں اب ان کا کیا حشر ہوا وہ ہم سے مخفی ہے۔ فقط

سحر (عثمانیہ) پربھنی

طالب آملی کا وہ شعر جس کے پہلے مصرعہ کو سنوارنے میں اوس نے چھ مہینے صرف کئے تھے

زغارت چمنت بر بہار منت ہا است
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

ایک گیت

یہ گانے بیگانے
راگی — چھیڑ نہ راگ پرانے
سپنے ہیں وہ غم کی راتیں
ٹوٹے وہ پیمانے
وہ باتیں افسانے — راگی —
چھیڑ نہ راگ پرانے

بسری یاد دلائی
تو نے — راگ سے آگ لگائی
دل کی دل میں ہی تو اپنی
کبھی تو بات پرائی
کون کسی کی جانے — راگی
چھیڑ نہ راگ پرانے

راگ کے رنگ ہیں گہرے
بدلے — اپنے غم کے پہرے
تو نے چھیڑا وہ کیوں قصہ
اب کیسے دل ٹھہرے
اب کیسے دل مانے — راگی
چھیڑ نہ راگ پرانے

تارے ہاتھ ملائے
میرے — گیت سے گیت ملائے
میں ہوں ان کی پریم پجارن
وہ میرے متوالے
وہ میرے دیوانے — راگی
چھیڑ نہ راگ پرانے

ہار کے جیتے جوگی
دونوں — دونوں پریم کے روگی
جس کے ایسے ہوں من موہن
وہ دکھیا کیا جانے
وہ دکھ کو کیا جانے — راگی —
ایک ہوئے دو تن من
من کی — دور ہوئی ہے الجھن
وہ شمعیں کافور ہوئیں ہیں
نئے دیئے ہیں روشن
نئے ہیں اب پروانے — راگی۔
چھیڑ نہ راگ پرانے

یوسف ظفر بی۔اے (ادبی دنیا)

اقوال

(از سحر صہبائی)

(۱) شرم اور خاموشی عورت کا بہترین زیور ہے۔ (اربیڈس)

(۲) عورت کے محبت بھرے دل سے زیادہ بڑی چیز دنیا میں کوئی نہیں (لوتھر)

(۳) تھوڑی فرقت محبت کو بڑھاتی اور زیادہ فرقت محبت کو قتل کر ڈالتی ہے (میرابو)

(۴) عورت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ مرد کو مانوس کرے۔ (والٹیر)

(۵) مرد کو خدا سے ہمیشہ دعا کرنی چاہیئے کہ عورت اُس کی حقیقت نہ جاننے پائے (تھیکرے)

(۶) آدم علیہ السلام سب سے زیادہ خوش نصیب انسان تھے کہ انہیں ساس نہ تھی (یا رفیہ)

(۷) حسن بغیر نزاکت ایسا ہے۔ جیسے بے نمک کھانا۔ (ایمرسن)

(۸) ارسطو سے پوچھا گیا۔ حسن کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا یہ سوال اندھوں سے کرنا چاہیئے (بیکن)

(۹) حسن جہاں بھی ہوتا ہے۔ سراہا جاتا ہے۔ (گوئٹے)

غزل

اب خود کو بھی نظر سے گرانے لگا ہوں میں
نقش دوئی کو دل سے مٹانے لگا ہوں میں

دامن کی دھجیاں جو اڑانے لگا ہوں میں
دیوانگی کو ہوش میں لانے لگا ہوں میں

یہ اوج شوق دیکھئے دونوں جہاں کو آج
دل کی بلندیوں سے گرانے لگا ہوں میں

ہو جانتا ہوں حسن کی وعدہ خلافیاں
پھر بھی فریب حسن میں آنے لگا ہوں میں

کل بے نقاب آپ ہی آئے تھے روبرو
بے پردہ آج سامنے آنے لگا ہوں میں

سیکھی ہیں چال تیرے وہ قیامت خرامیاں
ہر ہر قدم پہ فتنے جگانے لگا ہوں میں

ممکن نہیں ہے حسن و محبت کا ارتباط
سورج کو یہ چراغ دکھانے لگا ہوں میں

کچھ ایسا رنگ لایا ہے اب جذبۂ مجاز
پردہ حقیقتوں کا اٹھانے لگا ہوں میں

ہر شئے سے بے نیاز ہوں بس ماسوائے دوست
ہر ماسوا کو دل سے بھلانے لگا ہوں میں

خود دیکھے اپنے دل کو تڑپنے کا مشورہ
اپنی لگی ہیں اور لگانے لگا ہوں میں

وہ لطف قرب دوست میں حاصل کیسے امید
جو لطف انتظار میں پانے لگا ہوں میں

ارشاد احمد فاضلی امید

خوابِ درخواب

ریل اندھیری رات کی خوفناک تاریکی کو چیرتی زور و شور سے آگے بڑھی جارہی تھی۔ اور "راقم الحروف" درجہ اوّل میں بیٹھے بالکل تن تنہا سفر کر رہے تھے۔ تنہائی کے علاوہ آج کے ہیبت ناک منظر سے ہمارا دل مارے خوف کے دھک دھک کر رہا تھا۔ ناجانے کیا کیا خوفناک خیالات ہمارے دماغ شریف پر چھائے ہوئے تھے۔ اور ہم ان ہی خیالات کے بے پایاں سمندر میں بہے جارہے تھے کہ اتنے میں گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُکی۔ اور ہماری نظریں ڈبہ کے دروازہ پر جم گئیں۔ تھوڑی دیر بعد "محافظ" نے سیٹی بجائی۔ اور انجن نے جھنگاڑ کر ڈبوں کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور ساتھ ہی کوئی ہمارے ڈبہ میں داخل ہوا۔ جب وہ اندر آچکا تو ہم نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اور اس پر ایسا ظاہر کیا کہ ہم دیر سے میٹھی نیند کے مزے لینے میں مصروف ہیں

اس سے پیشتر کہ ہم اپنا "چہرۂ مبارک" بھی لحاف میں چھپائیں کہ کسی نے ہمیں اس زور سے جھنجوڑا کہ ہم بڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ اب جو ہم نے نظر اٹھا کر اپنے کرم فرما کو دیکھا تو واللہ ششدر رہ گئے، ایک عورت نہایت حسین و جمیل چہرہ پر کالی جالی کا نقاب ڈالے، اور ہاتھ میں ایک دونالی کی پستول لئے کھڑی مسکرا رہی تھی جونہی ہم بستر سے اُٹھے، اُس نے پستول کی نالی ہماری طرف کردی۔ اور نقاب کو درست کرتے ہوئے فرمانے لگیں۔

"کچھ دائیں ہاتھ سے دھروتیے مولانا"

"دھمکی کسی۔۔ اور۔۔ اور کو دیتا حضرت" ہم نے دل کڑا کے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے۔۔ تو سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلنے کا۔

"گھی نہ نکلے۔۔ تو تیل کھاؤ۔۔ ناحضرت"

"بہت غاٹے معلوم ہوتے ہو"

"ذرا منہ سنبھال کر بات کیجئے۔۔۔ میں بھی مغل ہوں"

"اچھا تو آپ مغل ہیں۔ کیا نام ہے تمہارا" ؟

"مرزا بشارت اللہ بیگ"

"کون بشارت صاحب۔ فسانہ کے ایڈیٹر"

"جی"

"معاف کرنا بشارت صاحب۔ میں نے پہچانا نہیں۔ مدت ہوئی آپکا فوٹو مصور اور سرپنچ میں دیکھا تھا۔ آپ کے مضامین بھی پڑھے تھے۔ چلو آج آپ سے بھی مل لی۔"

"وہ بھی پستول دکھا کر"

"اچھا پہلے آپ یہ فرمائیے کہ کیا ان پرچوں میں آپ کے مضامین ہیں۔"

اس نے چند پرچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا

"جی ہاں! ان سبھوں میں"

میں نے تمام پرچے سمٹ کر اُس کو دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا شکریہ۔ اب میں جاتی ہوں"

یہ کہہ کر اس نے تمام پرچے بغل میں دبائے۔ اور دھم سے چلتی گاڑی سے کود پڑی۔ ارادہ تو ہوا کہ ہم بھی اس کے ساتھ کود پڑیں۔ کیونکہ ساری عمر میں پہلی مرتبہ یہی داد تو اسی لڑکی نے دی تھی۔ ہم ابھی اس کودنے اور نہ کودنے کے مسئلہ کو حل کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں کسی کی سرگوشیوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا اب جو ہم نے ادھر کان لگائے تو ایک صاحب فرما رہے تھے۔

"جی ہاں! دیکھئے خانصاحب، کیسے ٹانگ پھیلائے سو رہے ہیں۔"

"اٹھاؤ بائی اٹھاؤ اس کو۔ ورنہ ہم لات مار کر کھڑکی کے باہر پھینک دے گا" کسی خانصاحب نے کہا

ہم اس لات وات کے قصے کو سن کر چونک پڑے۔ اب جو اٹھ کر ڈبے پر نظر دوڑاتے ہیں تو بس کھٹ سے یہ کسی کا کہنا یاد آ گیا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا اور جو سنا افسانہ تھا۔

جونہی ہماری آنکھ کھلی، ریل ایک ہلکے سے جھکولے کے ساتھ رکی، اور ساتھ ہی قلی نے للکار کر کہا "سکندرآباد" اور ہم نے جھٹ سے بستر بغل میں دبایا، لوٹا صراحی، توشہ دان اور جوتا ٹوپی ہاتھ میں پکڑے دروازہ پر آ کھڑے ہوئے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہم خود فربہ قسم کے اشرف المخلوقات واقع ہوئے ہیں۔ اس پر سونے پر سہاگہ بستر صندوق، اور لوٹے صراحی سے لدے ہوئے تھے۔ ڈبہ کے دروازہ سے نکلنا ذرا مشکل ہی تھا۔ جب خانصاحب ور استہ نہ ملا تو انہوں نے اس زور سے پیچھے سے لات رسید کی کہ ہم دھڑام سے پلیٹ فارم پر مع توشہ بستر، چاروں شانہ چت آ گرے، اور ساتھ ہی ہم نے ایک چیخ لگائی اور اُٹھ بیٹھے۔ اب جو ہم نے آنکھیں مل کے چاروں طرف دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم عدالت کے ایک کمرے میں پڑے ہیں۔ اور دو چار چپراسی ہمیں گھیرے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا

" ارے نہیں خاں۔ اِن کو دورہ ہوا تھا شاید"

" نہیں یارو۔ کوئی براخاب (خواب) اگرا مریکا ہے۔

یہ کہہ سن کے جب سب کے سب چلدئیے تو ہم اُٹھ بیٹھے۔ پہلے ہم نے خود اپنے کو ایک چٹکی بھری اور جب کامل یقین ہوگیا کہ ہم عالم بیداری میں ہیں تو منہ ہاتھ دھویا۔ اور عدالت آنے کا سبب سوچ ہی رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے ایک موکل نے فرشی سلام کرکے کہا۔

" آج اپنا مقدمہ ہے نا سرکار "

" شاید سرقہ کا مقدمہ ہے تمہارا " ہم نے دریافت کیا

" جی۔ سرقہ ورقے کا نہیں۔ ۔ بلکہ قتل ہے حضور "

" قتل کا ہے صرف "

" جی "

" اچھا پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کس تاریخ کو قتل کیا گیا تھا "

" مجھے "

" ہاں ہاں۔ ۔ ۔ تمہیں "

" حضور میرا قتل نہیں۔ ۔ ۔ بلکہ میں نے جو قتل کیا ہے۔ ۔ ۔ "

" تم نے قتل کیا۔ ۔ تو تمہیں ضرور پھانسی ملے گی۔ ۔ واہ واہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم قتل کرو اور پھانسی نہ ملے۔ نہیں نہیں تم ضرور مارے جاؤ گے "

" ذرا ہوش کی باتیں کیجئے وکیل صاحب "۔

" میں تمہیں کبھی نہیں بچاؤں گا۔ ۔ میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ تمہیں موت کی سزا دی جائے موت کی۔ ۔ آہ آہ موت کی سزا "

" اچھا تو یہ بات ہے وکیل صاحب "

یہ کہکر اُس بدمعاش نے ایک ایسی زور سے لٹھ رسید کیا کہ ہم غش کھا کر زمین پر جا گرے۔ جب ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ راقم سسرال میں نرم نرم گدوں پر آرام فرما رہے ہیں اور بیگم صاحب ہمیں جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہی تھیں۔

" اجی اُٹھو نا۔ ۔ سینما کا وقت جا رہا ہے "

از مرزا بشارت اللہ بیگ (حیدرآباد دکن)

آہ اے آئینہ دارِ گردشِ رنگِ نشاط ✤ تیرے دم سے تھی کبھی رنگیں گلستاں کی بساط
چبھ رہی ہے روحِ گلشن میں پرافشانی تری ✤ کھائے جاتی ہے بہاروں کو پریشانی تری
رو رہی ہیں عبرتیں اس منظرِ غمناک پر ✤ فصلِ گل کو نوحہ گر پاتا ہوں تری خاک پر

صبح کے انوار افسانہ سناتے ہیں ترا
سوگ اربابِ گلستاں اب مناتے ہیں ترا

آہ اے جامِ شرابِ عیش کے رنگیں حباب ✤ کس قدر صبر آزما ہے زندگی کا انقلاب
جھوم کر اٹھتی ہے کیا اب بھی گھٹا تیرے لئے ✤ رقص کرتی ہے کبھی اب بھی صبا تیرے لئے
شبنم اپنے آنسوؤں سے منہ دھلاتی ہے ترا ✤ ناز کیا اب بھی سحر کی ضو اٹھاتی ہے ترا
چھیڑتی ہے کیا تجھے اب بھی باندازِ کہن ✤ وہ تری ہنس مکھ سہیلی صبح کی پہلی کرن

رخ سے گردِ نامرادی دھونے والا بھی نہیں
تجھ پر اس عالم میں کوئی رونے والا بھی نہیں

تین لڑکیاں

تین لڑکیاں ریل میں بیٹھی چلی جا رہی تھیں۔ ڈاک گاڑی کی رفتار ہوا سے باتیں کر رہی تھی پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور انجن کی سیٹی کی آواز بالکل غیر شاعرانہ سہی مگر ان کے مسلسل شور میں ترنم پیدا ہو رہا تھا اور خاصکر جب وہ جنگل کی فضا میں گونجتی تو ایسا دلفریب نغمہ سنائی دیتا کہ رُوح وجد کرنے لگتی۔

تین لڑکیاں ریل میں بیٹھی چلی جا رہی تھیں۔

تین لڑکیاں!

تینوں کے چہروں پر جوانی کی خوشیاں جھلک رہی تھیں، تینوں کے جسموں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا تینوں خوبصورت تھیں۔ ایک شاعرہ تھی اور اپنا تخلص نرگس رکھتی تھی۔ ایک انشاء پرداز تھی۔ اس کو اس کے والدین ریحانہ کہتے تھے۔ ایک مقرر تھی جس کو صبیحہ سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

تینوں لڑکیاں ریل میں بیٹھی چلی جا رہی تھیں۔

تین لڑکیاں۔!

تینوں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے نئے نئے ارمانوں اور اُمنگوں کو اپنے دامن میں لئے اپنے وطن حیدرآباد کو واپس لوٹ رہی تھیں۔ مگر تینوں اپنی عزیز اُستانی کی وداعی تقریر سے ابھی تک متاثر تھیں۔ ہر گھڑی ان کے کانوں میں اُستانی کے گرجدار الفاظ گونج رہے تھے۔

"میری بچیو! تمہیں سے قوم کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ تمہاری ترقی قوم کی ترقی ہے کیونکہ تمہارے ہی گودوں میں پرورش پائے ہوئے بچے قوم کی باگ سنبھالنے والے ہیں۔ تم تعلیم سے فارغ ہو چکی ہو۔ تم کو چاہئے کہ اپنی غیر تعلیم یافتہ بہنوں کو ان سے مالا مال کرو۔ میری نظروں میں یہی سب سے بڑی قومی خدمت ہے۔ تم آج کالج کی چار دیواری کو خیرباد کہہ رہی ہو اس لئے میری دلی دعا ہے کہ خدا تم میں اتنی سکت دے کہ تمہارا ہر قدم قوم کی بھلائی کے لئے اُٹھے اور تم ہمیشہ وطن کی محبت میں سرشار رہو دنیا کو بتلا دو کہ تم میں بھی چاند بی بی جیسی اور سلطانہ رضیہ جیسی حکومت کرنے کی قابلیت موجود ہے"

یہ وہ الفاظ تھے جو ان لڑکیوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ نرگس نے انگڑائی کے ساتھ آرم کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ریحانہ اور صبیحہ خاموشی کے ساتھ قدرت کے دلچسپ مناظر سے

لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہونچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آگئی تھی۔ ایک طرف امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں" باغوں کے رکھوالوں کی ہُو ہُو عجیب دلچسپ سماں پیدا کر رہی تھی بہار کا موسم دیکھتے ہی دیکھتے ستارے بادلوں کا لحاف اوڑھ کر نظروں سے اوجھل ہونے لگے ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی۔ رات سردی سے ٹھٹھرنے لگی اور تاریکی ٹپکپا رہی تھی۔

سردی کی شدت سے تینوں لحاف اوڑھ کر لیٹ گئیں سرد ہوا کے جھونکوں نے تھپک تھپک کر ان کو نیند کے آغوش میں پہونچا دیا صبح چار بجے ڈاک گاڑی نے جھٹکے کے ساتھ اپنے کو پرتھی اسٹیشن پر روکا تینوں نیند کی متوالی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں اور منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا ہوا تیزی سے برہنہ شاخوں سے سیٹیاں بجاتی ہوئی چیختی گذرنے لگی تھی بعض لوگ گاڑی پر سوار ہو رہے تھے بعض گاڑی سے اتر رہے تھے۔ تینوں سہیلیاں اپنی جگہ بیٹھیں اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اتنے میں ایک صاحب یورپی لباس میں ملبوس قلی قلی پکارنے لگے۔ ایک قلی صاحب بہادر کی آواز سن کر دوڑتا ہوا آیا' اور صاحب بہادر کا سامان اٹھا کر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں قرینہ سے جما دیا اور نہایت ادب سے ہاتھ جوڑتے ہوئے مزدوری کے پیسے طلب کئے صاحب بہادر نے نہایت نفرت سے ایک دو آنی اس کی طرف پھینکدی اور پھر اس کے پھٹے ہوئے گرد آلود کپڑوں کو حقارت سے دیکھنے لگے۔ تینوں لڑکیاں اس منظر کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ نرگس کی دوربین نگاہوں نے صاحب بہادر کے احساسات کو تاڑ لیا اور اپنی سہیلیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگی" ادھر دیکھو! صاحب بہادر اس غریب مزدور کو کس غرور اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ دل میں تو یہ خیال کرتے ہوں گے کہ کیوں نہ اس نیم جان کو مسل دوں۔ کیوں نہ اس بدنصیب کو کچل دوں آخر اس ذلیل کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق کیا ہے۔ یہ تو انسان کے روپ میں ایک کیڑا ہے۔ اگر اس کے پاس کھانے کو پیسے نہیں تو پھر اس کو جینے کی خواہش کیوں۔

صبیحہ جو یہ سب سُن رہی تھی۔ بیتاب ہو کر بول اُٹھی بہن تم نے مجھے اس وقت ایک انوکھا سبق پڑھا دیا۔ مگر صاحب بہادر کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر یہ مزدور نہ ہوتے تو ان کا جینا مشکل ہو جاتا وہی ہاتھ جو قیمتی گھڑی اور انگوٹھی سے مزین ہیں انہیں کو یہ سب کچھ کرنا پڑتا جس کے کرنے والے کو آج وہ حقارت سے دیکھ رہے ہیں"

تینوں خاموش ہوگئیں۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ گاڑی خراماں خراماں چلنے لگی۔ ریحانہ اپنی بہنوں کو سامان اکٹھا کرنے کے لئے کہتے ہوئے خود سامان باندھنے میں مشغول ہوگئی کیونکہ اُن کی منزل

قریب آرہی تھی نرگس (سامان باندھتی ہوئی کہنے لگی) اُستانی ماں کا ایک ایک لفظ میرے دل پر کندہ ہوگیا ہے اور میں جہاں تک ہو سکے ان قیمتی نصیحتوں کو اپنے سینے میں محفوظ رکھوں گی اور حتی الامکان اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گی پھر ریحانہ اور صبیحہ سے مخاطب ہوکر "مجھے اُمید ہے کہ تم لوگ بھی میرا ساتھ دوگی۔

صبیحہ ہاں ہاں ضرور! آخر ہماری زندگی کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہیے آخر ہم پر بھی تو کچھ فرائض عاید ہوتے ہیں صرف پیدا ہونا اور مرجانا کوئی زندگی نہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "کہ زندگی سالوں اور گھڑیال کے کانٹے سے نہیں گنی جاتی بلکہ اچھے اچھے کاموں سے گنی جاتی ہے۔

تینوں دل میں عزم کرچکی تھیں کہ وطن پہونچکر اپنی قوم میں زندگی کی روح پھونک دیں گی اس کے پژمردہ قلب کو تازگی بخشیں گی۔

- حیدرآباد گاڑی ساڑھے سات بجے پہونچتی ہے۔ تینوں سامان درست کرکے خاموشی سے قدرت کی صناعی کو دیکھنے میں مشغول ہوگئیں۔ صبح کے چھ بج چکے تھے۔ کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں کی طرف جارہا تھا آگے آگے ایک دیہاتی دوشیزہ گاتی چلی جارہی تھی۔ کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے کنٹے بنے ہوئے تھے جو پانی سے بھرے پڑے تھے پانی کافی شفاف تھا کنارے پر اُگے ہوئے درختوں کا سایہ اس میں منعکس ہورہا تھا البتہ جب لہریں پیدا ہوتیں تو یہہ سایہ اس طرح حرکت کرتا گویا افقی چادریں سیماب پر بل کھا رہی ہیں گاڑی کسی اونچے ٹیلے یا چھوٹی پہاڑی کے مقابل پہونچتی تو سورج اس کے عقب میں روپوش ہوجاتا لیکن جب وہ میدان سے گذرتی تو دوبارہ نظر آنے لگتا۔ منظر کی یہہ متضاد کیفیت بھی عجیب لطف پیدا کررہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کاچی گوڑہ اسٹیشن آپہونچا۔ تینوں لڑکیاں اچھے جذبات اور بلند حوصلوں کو اپنے سینوں میں لئے ہوئے ریل سے نیچے اتریں اب یہہ تینوں ایک ٹکسی میں بیٹھیں اپنے اپنے گھروں کو چلی جارہی تھیں۔ فقط

محمد رحیم الدین

قطعہ

باغ میں کچھ پھول توڑے اور بنایا ایک ہار
آپ کے آنے کا جب دل کو یقین ہونے لگا
وائے! ناکامی نہ آئے آپ اور میں بدنصیب
ہار خود اپنے گلے میں ڈال کر رونے لگا

شاہد صدیقی

عہد

نظر حیدرآبادی

تمنا ہے یونہی جب بیخود و سرشار ہو دنیا
گھٹائیں بوندیوں کے ساز پر نغمے سناتی ہوں
کسی نوخیز کے پازیب کی جھنکار ہو دنیا
فضائیں سردیوں میں دل کی گرمی سی نہاتی ہوں
ہوائیں روح کو سرشاریاں دیتی ہی رہتی ہوں
جنون کی پاک دیوی ہوش کے نغمے چھڑکتی ہو
نگاہیں کیف زا انگڑائیاں لیتی ہی رہتی ہوں
دلوں کی آگ پانی کی جھاجھم میں بھڑکتی ہو
تمنا ہے یونہی ایسے میں میں مدہوش ہو جاؤں
تری زلفوں کے سائے میں ترا چہرہ چھپا دوں میں
یونہی ہاں کوئی موسم ہو یونہی بیہوش ہو جاؤں
تجھے پھر قبلۂ و سرمستیٔ رندان بنا دوں میں
یہی عالم رہیگا میں رہوں گا اور تو ہو گی!
قیامت تک کوئی ہم کو پریشاں ہی نہ دیکھے گا
مرادیں بر نہ آئیں ایسی بھی اک آرزو ہو گی!
دلوں کے آئینہ کو کوئی حیراں ہی نہ دیکھے گا
ادھر آ تجھ کو رکھ لوں اپنے سینے میں ادھر آ جا
ابھی دنیا سے درد و رنج کے جھگڑے مٹانے ہیں
یہیں رہنا ہے جاتی ہے کہاں پھر نظر آ جا
ستارے اس زمیں پر اپنی آنکھوں سے گرانے ہیں
جو تیرا عہد محکم ہے بدل جائیں گی تقدیریں!
مرے اخلاص کے خوابوں کی مل جائنے دے تعبیریں!!

انوکھا بیاہ

ایک کرم فرمانے دعوت دی کہ ان کے "بے پالک" کی خانہ آبادی کی تقریب میں ہم ان کے ساتھ ماحضر تناول کریں بیاہ کے دن مغرب کے بعد ہم دعوت میں پہنچے' صحن میں ایک شامیانے کے نیچے بہت سی کرسیاں اور صوفے سلیقے سے جمائے گئے تھے اور ان کے بیچوں بیچ تخت پر نوشہ میاں سلمہ کی مسند لگی تھی' مہمان آنے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی دولہا میاں قدم رنجہ نہیں ہوئے تھے' ایک دوسرے شامیانے میں دسترخوان چنے جا رہے تھے' کوئی ڈیڑھ دو سو مہمانوں کے کھانے کا انتظام ہو گا۔ مکان بجلی کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا' ہم نے میزبان صاحب کی فراخدلی کی دل ہی دل میں خوب داد دی کہ وہ اپنے "لے پالک" کا بیاہ اس شان سے کر رہے ہیں اور جی کھول کر اوس کے ارمان نکال رہے ہیں۔

شامیانے کے اندر داخل ہوتے ہی جب صاحب خانہ آگے بڑھے تو ہم نے مصافحہ کے بعد اُنھیں مبارکباد دی اور کہا " اللہ پاک آپ کو اس کا اجر دے گا کہ آپ اپنے "لے پالک" کا بیاہ اس فیاضی سے کر رہے ہیں"!

ہمارے میزبان نے ہم سے بغل گیر ہو کر شکریہ کے بعد کہا۔

آج کی تقریب میں آپ کو بڑا لطف آئے گا' "ایک انوکھا بیاہ" ہم آپ کو آج دکھائیں گے"!

اس نرالے بیاہ کو دیکھنے کے شوق میں ہمارے پیٹ میں چوہے کودنے لگے ہم نے پوچھا

"آپ کا مطلب ہم کچھ نہیں سمجھے' آخر یہ "انوکھا بیاہ" ہے کیا بلا"؟

بے تکلفی سے فرمایا

"تم نے ابھی دیکھا کیا ہے' دنیا کے ساتھ سب رنگ بدل رہے ہیں' کبھی شیر بکری کو تم نے ایک گھاٹ پانی پیتے دیکھا ہے"؟

ہم نے جواب دیا "نہیں! البتہ سرکس میں سہمی ہوئی بکری کو شیر کے ساتھ کھڑا ہوا تو ضرور دیکھا ہے"!

میزبان صاحب۔ مسکرا کر بولے۔

اجی جناب! سرکس میں بکری کو نشیلی چیزیں کھلا کر شیر کے ساتھ کھڑا کر دینا کونسا کمال ہے"!!

ہم نے عرض کیا "تو آج آپ ہمیں شیر بکری کا بیاہ دکھانے والے ہیں!

قہقہہ مار کر فرمایا "یار تم تو نرے گاؤدی نکلے! عقل تو تمہیں چھو تک نہیں گئی!! بھلا کہیں شیر بکری کا بیاہ بھی

ہوا ہے! ہم بہت چکرائے، ذہن پر جتنا زور ممکن تھا ڈالا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں توپ کی گرج نے آمد کا اعلان کیا اس آواز کے ساتھ ہی بیانڈ، تاشے، نوبت، روشن چوکی اور قسم قسم کے باجے بجنے لگے۔ "دولہا آرہا ہے!" کی صدائیں بلند ہوئیں، آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنی کے ساتھ دور سے ایک "پالکی" آتی نظر آئی غالباً پیٹرول نہ ملنے کے راشن کی وجہ سے دولہ میاں موٹر کے عوض "پالکی" میں آرہے تھے۔

جب پالکی ذرا نزدیک آئی تو نوشہ میاں کو دیکھ کر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، آنکھیں مل مل کر ہم نے پالکی کے اندر بہت غور سے جو دیکھا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک "ابلق" کتا کارچوبی جھول اوڑھے، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے "ہز ماسٹرس وائس" کے کتے کی طرح پالکی میں بیٹھا ہوا ہے، یہ منظر دیکھ کر ہمیں اپنی نظر کو "نظر" لگ جانے کا اندیشہ ہوا، میزبان صاحب ہمارے بازو ہی کھڑے مسکرا رہے تھے، ہماری پریشانی کو دیکھ کر ہمارے کان میں آہستہ سے کہا۔

"ہم نے کہا نہ تھا کہ تم نرے احمق ہو! احمق!! تمہیں تو شیر بکری کے بیاہ کی سوجھی تھی!!! بھلا کہیں شیر بکری کا بیاہ بھی تم نے ہوتے دیکھا ہے؟ تم بھی کیا یاد کروگے آج تمہیں ہم ایک "انوکھا بیاہ" دکھاتے ہیں! ارے میاں ہم نے آج وہ کر دکھایا ہے جس کو تمہارے فرشتے بھی نہ کر سکیں!! رہتی دنیا تک ہماری یہ یادگار قائم رہیگی، کچھ سمجھے تم"؟

ہم نے اپنے نرے احمق ہونے کو تسلیم کر کے کہا۔

"آپ کی باتیں تو آج ہمارے لئے پہیلیاں ہیں کچھ صاف صاف کہئے تو سمجھیں کہ آخر آج یہ ہو کیا رہا ہے؟ ہمیں تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، واقعی آج ہماری عقل رفو چکر ہو گئی ہے"!

مہربان میزبان نے قہقہہ لگا کر فرمایا۔

"تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم آج "گھن چکر" بن گئے ہو! اچھا تو آپ بھی سمجھ میں کچھ نہ آیا"؟

مگر سمجھے تو یہ سمجھے کہ اب تک کچھ نہیں سمجھے"!

ہم نے کہا" کیا خاک سمجھ میں آئے گا! کچھ سمجھنے کی بات بھی تو ہو"!!

بڑے طنز سے وہ بولے "سمجھنے کے لئے سمجھ بھی تو ہو! ارے تم اتنا نہیں سمجھے کہ ہمارا لاڈلا "سکندر" دولہا بنا پالکی پر چڑھا کیوں آرہا ہے؟ سنو! ہم نے آج اس کا بیاہ رچایا ہے!! تم کہوگے یہ کیا حماقت ہے! ایک کتے کی اس دھوم دھام سے شادی کیوں کی جارہی ہے"؟

ہم نے جواب دیا" یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں! آخر یہ تم ظریفی کیا ہے"؟

ہنس کر فرمایا" اب بھی تم کچھ نہیں سمجھے؟ سنو واقعہ یہ ہوا کہ بیگم جب کبھی ہم سے لڑتیں جھگڑتیں تو کہتیں ہماری زندگی کتے بلی کی ہو گئی ہے، یہ حالت تو کرتیں خود اور بنا تیں ہمیں کتا "ایک اللہ اسی طرح لڑائی" ہو رہی تھی اور بیگم بار بار کہہ رہی

تھیں کہ کتے بلی کی زندگی سے ناک میں دم آ گیا ہے!! ہم نے زچ ہو کر کہا بیگم تم تو بلی سے بھی گئی گذری ہو! بلی میں جتنی سمجھ ہے تم میں اتنی بھی نہیں اگر کسی بلی کو سدہار کتے سے بیاہ دیا جائے تو چاہیئے وہ ہسپتال میں کسی بچہ کا سر کیوں نہ چبا ڈالے مگر وہ ہرگز اس طرح بات بات پر نہ لڑے گی جس طرح کہ تم الجھتی ہو، بگڑتی ہو، جھگڑتی ہو اور زبان چلاتی ہو"!!

"بیگم نے چلا کر کہا "جب تم بلی کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو تو کسی سمجھ دار بلی" سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے"!

"ہم نے کہا "بیگم! ذرا سوچ سمجھ کر بولو!! تم اپنے محترم شوہر کی جناب میں یہ کیا کہہ رہی ہو؟ ہم انسان ہو کر بلی سے بیاہ کریں!! ہماری بلی تو تم ہی ہو!!! بلی کا بیاہ تو ایک دن ہم کتے سے کر دکھائیں گے"!

"یہ سنتے ہی بیگم نے پھر چیخ پکار شروع کر دی اور بولیں اگر تم کتے کا بیاہ بلی سے کر دکھاؤ تو سمجھوں کہ تم اپنے وقت کے "لقمان" ہو! اس دن سے اگر تمہاری "باندی" بن کر نہ رہوں تو کہنا"!!

"ہم نے جواب دیا انشاء اللہ ایک دن ایسا ہی ہوگا! بلی کی ہٹ تمہاری "تریاہٹ" کے آگے کچھ بھی نہیں!! اس کو سدھا سکتے ہیں مگر تم سے تو بس خدا ہی سمجھے"!!!

"ہمارے اس "ریمارک" پر بیگم اور بپھریں تو اپنی "کنیزی" کے نوشتہ کے علاوہ ایک ہزار روپے کی شرط بھی لگا دی باندھنے کو تو ہم نے شرط باندھ لی مگر کتے بلی کے "سنجوگ" کی ہمیں بڑی فکر لگ گئی، دو چار روز اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد ہمارے "ذہن رسا" میں ایک تدبیر آئی، ہم نے کتے بلی کے دو چھوٹے چھوٹے بچے خریدے اور ان دونوں کو اکٹھا رکھ کر پالنا شروع کیا، جب انھوں نے کچھ ہوش سنبھالا تو آپس میں لڑنے لگے، اب ہم نے زیادہ وقت ان کی تربیت میں صرف کرنا شروع کیا، ایک چھوٹا سا چابک لیکر سرکس کے ماسٹر کی طرح ہم انہیں روز سدھاتے جہاں یہ دونوں لڑے کہ ہم نے چابک رسید کیا، دونوں تلملا کر رہ جاتے، ایک بڑا پنجرہ ہم نے ان دونوں کو رکھنے کے لئے بنایا، چابک کے ڈر سے ان کا لڑنا تو بہت کچھ کم ہو گیا مگر ایک دوسرے سے دور دور رہتے، اب ہم نے ترکیب یہ کی کہ ایک ہی برتن میں دونوں کے لئے دودھ، بالائی، روٹی، بسکٹ، گوشت وغیرہ رکھنا شروع کیا، یہ تدبیر کارگر ہوئی اور چند ہی دنوں میں دونوں میں خاص دوستی ہو گئی۔

"کتے بلی کی ان بن دنیا جہاں میں مشہور ہے مگر ہم نے دونوں میں یگانگت پیدا کر دی، چند مہینوں کے بعد اس ملاپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری "فیروزہ خانم" کے دو بچے ہوئے مگر یہ انوکھے سنجوگ کے بچے بھی انوکھے نکلے! بچوں کے چہرے ہو بہو "سکندر" جیسے اور جسم "فیروزہ خانم" کا سا، گویا کہ بلی کے دھڑ پر کتے کا سر لگا ہوا ہے انھیں دیکھ کر مارے خوشی کے ہم بچوں کی طرح اچھلنے کودنے لگے! ان بچوں کو گود میں اٹھا لیا اور ان کے ماں باپ کے ساتھ دوڑتے ہوئے بیگم کے پاس چلے اور دور ہی سے بیگم! بیگم!! چیخنے لگے۔

"بیگم مشین پر کچھ سی رہی تھیں، ہمیں سکندر اور فیروزہ خانم کے ساتھ گود میں کچھ اٹھائے جو آتا دیکھا تو

بیٹا چھوڑ کر اُٹھ گئیں کہ یہ کیا آفت آئی! جب ہم نے کتے کے سر اور بلی کے جسم والے بچوں کو بیگم کے سامنے ڈالا تو اُن کے ہوش اُڑ گئے۔

"بیگم کو پریشان دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہو رہی تھی، ہم نے تن کر کہا لائیے ہزار روپے اور باندی بنے رہنے کا اقرار نامہ! کتے بلی کے سنگم کے نتیجہ کو ذرا غور سے دیکھنا!!

"ایک عرصہ سے وہ کتے بلی کے ملاپ کو دیکھتی آ رہی تھیں اب ان بچوں کو دیکھ کر فرط ندامت سے گردن جھکا لیں اور چپکے سے کہا۔

"آپ جیتے میں ہاری! بے شک حیوان بھی تربیت سے انسان بن جاتا ہے!! آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ کہ انسان کو اور خصوصاً عورت کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے! میری ہی جہالت کی وجہ سے یہ سارے جھگڑے ہوا کرتے تھے اور ہماری زندگی کتے بلی کی سی ہوگئی تھی مگر جب کتے بلی میں بھی تربیت کے اثرات یگانگت پیدا کر سکتے ہیں تو بڑی شرم کی بات ہے کہ ہم انسان ہو کر ان حیوانوں سے سبق نہ لیں! انشاءاللہ اب کبھی آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہوگی، آج سے میں آپ کی بیگم نہیں باندی بن کر رہوں گی"!!

"ہم نے بیگم کو آبدیدہ دیکھ کر گلے سے لگا لیا اور کہا۔

"خدانخواستہ" باندی بنے آپ کی بلا! ہم تو آپ کو بیگم ہی رکھیں گے"!!

"اس واقعہ کو کوئی چھ مہینے ہوتے ہیں! بیگم اپنے قول کی سختی سے پابندی کر رہی ہیں، ہماری زندگی اب نہایت خوش گوار ہوگئی ہے، ہمارے لاڈلے "سکندر" اور پیاری "فیروزہ خانم" نے مل جل کر ہماری زندگی سنوار دی، آج ہم ان دونوں کا بیاہ رچا کر اپنی مسرتوں سے بھری نئی زندگی کا جشن منا رہے ہیں"!!

مرزا یوسف علی خاں۔

اگر آپ

ہر ماہ ملک کے بہترین ادباء کی تازہ تصنیفات کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں تو فوراً ادارۂ ارم کے رکن بن جائیے۔ آپ کو ہر ماہ کے ابتدائی ہفتے میں ۲۰۰ صفحات کی جاذب نظر کتاب گھر بیٹھے مل جایا کرے گی۔ فی الحال آپ رجسٹر اراکین میں اپنا نام درج کرا دیں۔ تفصیلات سے عنقریب اطلاع دی جائے گی۔

مینیجر ادارہ ارم سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد

مکالمہ

چوری

ایک نوجوان جس کا نام حامد ہے اپنے کمرے میں بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ باہر سے دستک سنائی دیتی ہے۔

حامد — کون ہے۔

” — میں اصغر حسین ہوں۔

حامد — تشریف لایئے۔

اصغر — اندر آ کر۔ اُف توبہ۔ خدا کی پناہ

حامد — کیوں بھائی اصغر آج تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔

اصغر — کیا بتاؤں۔

حامد — آخر ؟

اصغر — بڑی بھاری چوری ہو گئی ہے۔

حامد — ارے چوری۔ کتنے سَو کی۔

اصغر — اس کی قیمت کا صحیح اندازہ معلوم نہیں۔ البتہ چور کا اور مسروقہ چیز کا نام بتا سکتا ہوں۔

حامد — فرمایئے۔

اصغر — چور تو — ار ر . . . . بھئی بُرا نہ ماننا — آپ کے بھائی اکبر حسین ار . ر . . . . .

حامد — ہیں اکبر اکبر چور۔ ایک شریف خاندان کا لڑکا۔ کیا چرا کر اس نے اپنے خاندان کے نام پر دھبہ لگایا اسے کیا ضرورت تھی

اصغر — چرا لے گا کیا۔ میری ماما اور کیا ؟

حامد — ماما . . اچھا بتایئے تو اس نے کیسے چرایا ؟

اصغر — ماما لا کر دیجئے تو چرا کر بتلا دوں۔

حامد — ستایئے نہیں تفصیل سے بتلایئے۔

اصغر — اس کے یہاں کی ماما گم ہو گئی تھی۔

حامد — گم ہو گئی سے مطلب ؟

اصغر — بھاگ گئی۔ تو وہ میری ماما کو بہکا کر پھسلا کر لے گیا۔ یہ چوری نہیں تو اور کیا ہے۔
حامد — یہ تو کوئی چوری نہیں۔
اصغر — چوری کیسے نہیں۔ مجھے خود چولھے کے سامنے بیٹھ کر سخت گرمی میں آگ تاپنا پڑتا ہے۔
حامد — اور آپ کی بیگم کہاں گئیں۔
اصغر — بیگم بنی آج فیشن والی۔ مدرسہ گئی ہے ون۔ ٹو۔ کرنے۔
حامد — خیر تو کوئی دوسری ماما کو رکھ لیجئے۔
اصغر — جی جناب۔ آپ تو اپنے بھائی کی طرفداری کریں گے۔ دیکھئے بندہ تو چلا نالش کرنے۔
حامد — یہ بھی کوئی نالش کرنے کی بات ہے۔ لوگ تم پر ہنسینگے نہیں ؟
اصغر — بھائی ہے کر کے ایسا بول رہے ہو۔ ورنہ کسی کی بات ہوتی تو کہتے کہ ابھی جاؤ اور ضرور جاؤ۔ بلکہ میرے ساتھ عدالت تک چلتے۔
حامد — دیکھو بھائی میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ (جاتے ہیں)

(راستہ میں)

ایک دوست — کیوں بھائی اصغر اتنی جلدی میں کدھر جا رہے ہو۔
اصغر — جہنم میں تمہیں کیا کرنا ہے۔ اپنا کام کرو۔
دوست — اما ہم یہ تھوڑے کہہ رہیں کہ تم جنت میں جا رہے ہو۔ تم گھبرائے ہوئے نظر آئے تو ہم نے پوچھ لیا اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ تمہیں جہنم کی گرمی کھینچے لئے جا رہی ہے تو ہم کبھی یو پچھتے ہی نہ تھے۔

(کچہری)

منصف — کیا عجیب مقدمہ ہے بھئی تمہارا (ماما سے) اچھا بتاؤ تو نور بی (ماما کا نام) تم خود اکبر کے پاس چلی گئی تھی، یا یہ تمہیں بہکا کر لے گئے ؟
نور بی — حجور میرے کو اصغر ساب (صاحب) کے پاس گنج کام ہے میں اپنی کھوسی سے گئی۔
اصغر — جی جناب اکبر صاحب نے تو پہلے ہی اسے بہکالیا۔ بھلا اب وہ کیوں میرے پاس رہنے لگی۔
منصف — تمہارے پاس جب نہیں رہیگی تو اکبر کے یہاں رہنے دو۔
اصغر — نہیں جناب ہم تو اسے اپنے گھر لے جائیں گے اور باندھ کر رکھیں گے۔ مگر اکبر کے یہاں نہیں جانے دیں گے۔
منصف — بھئی تم دونوں کا لڑتے لڑتے خون ہو جائیگا۔ اس ماما کو میں رکھے لیتا ہوں۔ مجھے بھی ماما کی سخت ضرورت ہے۔ اچھی سستی ماما ہے۔ پھر دو کی لڑائی میں تیسرے کا فائدہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

آصف غازی اورنگ آباد

رباعیات

حضرت کیفؔ حافظی

میرا میخانہ ہے ساقی ہے نہ مینا میری
میں نہیں جانتا اے کیفؔ کہ دنیا کیا ہے
صرف احساس پہ رقصاں ہے تمنا میری
ایک موہوم سی اُمید ہے دنیا میری

لوگ کہتے ہیں کہ کیفؔ زندگی کو چھوڑ دوں
بات تو اچھی ہے لیکن مجھ سے ہو سکتا نہیں
جام امرت سے اس بس بھری کو چھوڑ دوں
کیسے ممکن ہے کہ پی کر منہ لگی کو چھوڑ دوں

منہ ہر اک شئے سے موڑ سکتا ہوں
پر یہ ممکن نہیں کہ وہ چھوٹیں
اپنی قسمت کو پھوڑ سکتا ہوں
ساری دنیا کو چھوڑ سکتا ہوں

جب کشمکش درد سے گھبراتا ہوں
افکار پریشان کو اکٹھا کر کے
یوں قصۂ دیرینہ کو دھراتا ہوں
احساس کی دنیا سے گذر جاتا ہوں

مری وحشت کے تاروں کو نہ چھیڑو
گھٹا سے برق سے طوفان سے الجھو
محبت کے شراروں کو نہ چھیڑو
مگر سینہ فگاروں کو نہ چھیڑو

دل محزوں طبیعت اور نالے
فلک دشمن زمانہ مدعی ہے
سنبھلتے ہی نہیں میرے سنبھالے
کدھر آواز دوں کوئی بچا لے

کم ظرفیٔ احساس کے مارے نہیں پیتا
اس واسطے پیتا ہوں کہ جل جائے جوانی
یا عیش و مسرت کے سہارے نہیں پیتا
واللہ کبھی لطف کے مارے نہیں پیتا

اک جرعۂ رنگیں کا پرستار ہوں میں
کیوں حشر میں رحمت کو زحمت مجھ سے
بدکیش ہوں بدنام ہوں بدکار ہوں میں
میں خود ہی نہ کہدوں کہ گنہگار ہوں میں

بہت مجبور ہو کر درد الفت کا چلن چھوڑا
ہے جب ناشاد ہی رہنا قفس کیا آشیانہ کیا
وطن چھوڑا وطن کیسا کہ احساس وطن چھوڑا
خزاں آئے نہ آئے آج سے میں نے چمن چھوڑا

رباعیات عطا

از حضرت عطا کلیانوی

(۱)

شادی ہے بلندی کی نہ غم پستی کا
میخواروں کو ہے شغل فقط مستی کا
کب دھر کی آفات کے وہ شاکی ہیں
پی پی کے مٹاتے ہیں الم ہستی کا

(۲)

ہوں رند مگر لایق تعزیر نہیں
زاہد کی طرح صاحب تزویر نہیں
ملجاتی ہے جو بھی بخوشی پیتا ہوں
قانع ہوں مجھے شکوۂ تقدیر نہیں

(۳)

ساقی کے کرم کی ہی جہاں میں اک دھوم
جاتا نہیں در سے کوئی اس کے محروم
کیا شان ہے ساقی کی بھی اللہ اللہ
میخانے کا خادم ہے، ہمارا مخدوم

(۴)

رسوا سر بازار ہیں میں بھی تو بھی
دنیا کے لئے عار ہیں میں بھی تو بھی
لت مئے کی مجھے، زہد کا پندار تجھے
اے شیخ گنہگار ہیں میں بھی تو بھی

(۵)

مئے پیتے ہیں ہم اس میں قباحت کیا ہے
رندوں کی بجز اس کے عبادت کیا ہے
زاہد تری دانست میں گر ہے یہ گناہ
کرلیں گے کبھی توبہ بھی عجلت کیا ہے

(۶)

کل کیا ہو نہ معلوم پلا دے کچھ آج
ساقی تو نہ کر دیر اٹھا جام زجاج
موقوف ہے اک چشم کرم پر تیری
تو چاہے تو ہو جائے غم دل کا علاج

(۷)

گہ جام میں مئے دیکھ کے مدہوش ہوا
گہ نغمہ کی خاطر ہمہ تن گوش ہوا
میخانے میں کس لطف سے گذری میری
میں بارہا ساقی سے ہم آغوش ہوا

(۸)

اللہ رے ساقی یہ ترا جوش شباب
کیا مستی ہے آنکھوں سے ٹپکتی ہے شراب
اس حسن کو میں سحر کہوں یا اعجاز
بے بادہ و بے جام ہیں سب مست و خراب

(۹)

ہیں رند خرابات حقیقت آگاہ
وہ راہ پہ ہیں ان کو نہ سمجھو گمراہ
کس نے یہ کہا؟ نامہ سیہ ہیں ان کا
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

(۱۰)

زنہار نہ ڈر گر ہے ترا نامہ سیاہ
اے رند تو رکھ فضل الٰہی پہ نگاہ
میخواروں پہ ہوتی ہے خدا کی رحمت
پی پی کے خرابات میں دھو ڈال گناہ

غالب کے ایک شعر کی تشریح

یہ کہاں کی دوستی ہے بنے ہیں دوست ناصح + کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

کسی چیز کی جب چھان بین اور دیکھ بھال کی جاتی ہے تو پہلے اُسے ناپ تول کر لمبائی چوڑائی کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس جانچ پڑتال میں اگر وہ چیز ٹھیک اُترے تو سمجھ لیجئے۔ ٹھیک ہے لہذا جب ہم نے اس شعر کو گا کر۔ گنگنا کر۔ اور تحت اللفظی میں پڑھکر دیکھا تو معلوم ہوا وزن کی حد تک اور معیار شعر پر ٹھیک اُترتا ہے۔ کمی کسی چیز کی نہیں آگے اب ہی تشریح تو لگے ہاتھوں اس کو بھی کر ہی ڈالیں کیا یاد کریں گے پڑھنے والے ارم کے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی سے پالا پڑا تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہ علم ہی کس کام کا جس سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچے۔ تو بس چل اے خامہ بسم اللہ اب۔

بھیا غالب کے اشعار میں معنی کے پہلو بہت سارے ہوتے ہیں۔ یہ نکتہ بڑا گہرا ہے اور اسے گرہ میں باندھ رکھیئے۔ تاکہ وقت ضرورت سند رہے اور کام آوے۔ اور پھر ایک آدمی کا یہ اپنا اپنا عقیدہ ہے کہ وہ مختلف مطالب اور معنی اپنے مقصد کے کھینچ تان کر نکال لیتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ پروفیسر زور۔ رشید احمد صدیقی۔ ملا رموزی۔ ایم اسلم۔ وغیرہ جو معنی اس شعر میں سے کرید کرید کر نکالیں گے وہ تو آپ کا جس دن چاہے انہیں خط لکھ کر دریافت کر لیجئے۔ لیکن اگر آپ کی عام فہم اور سلیس تشریحات سے دلچسپی ہے تو اس مضمون کو پڑھئے ورنہ یہیں بند کر دیجئے چلئے جھگڑا مٹا۔

ہاں صاحب تو حضرت قبلہ عم اردو دان۔ حضرات کا مقصد مصرعہ اولیٰ سے صرف دوستوں کی طرف اشارہ کرنا اور ان کی اقسام پر بحث کرنا تھا۔ بات میں بات نکل آتی ہے۔ اس لئے کہنا پڑتا ہے۔ عموماً دوست دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو بے غرض دوسرے غرض مند۔ اگر ہماری سنئے تو ہم علی الاعلان اور ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ دوستی بے مطلب ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا غرض ہوگی کہ آپ کسی کے دوست ہیں تو اس کا بھی آپ کی طرف مائل بہ دوستی ہونا ضروری ہوگا اور اسی کے ساتھ دوستی کے سارے لوازمات کا بھی ہونا ضروری ہے۔ مثلاً فرض کیا کہ آپ کسی کے دوست ہیں تو جب آپ کسی دوست کے ہاں تشریف لے جائیں گے تو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم یہ توقع تو رکھیں گے ہی کہ وہ آپ کی پان اور سگریٹ سے تواضع کرے۔ اور اگر دوستی ذرا گہرے قسم کی واقع ہوئی ہے تو پھر چار او[illegible] کی نوبت بھی [illegible] ہوا۔ یوں تو کہا جاتا ہے کہ انسان کی قسمت میں جو جو دانہ اناج کا اور جو جو قطرہ پانی کا بدا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نام کی مہر لگ چکی ہے۔ مگر پھر بھی کھانوں کے دانے دنکوں کے پانی کے قطروں پر سلسلے [illegible] کی کڑیوں کی طرح ان مہروں کے لئے بھی کسی رشتے اور ناتے کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ اور شاید اللہ میاں نے اپنی دانوں او[ر] قطروں پر مہریں بھی لگائی ہیں جو

جو یا تو اپنے ہی گھر میں ہوں یا کسی عزیز اور رشتہ دار کے گھر میں ہوں۔ یا دوستوں کے گھر میں ہوں۔ یا پھر کسی ہوٹل یا سرائے
اسٹیشن پر گوشت روٹی بیچنے والے کے باورچی خانہ میں ہوں۔ کیونکہ یہی وہ جگہ ہوسکتی ہے جہاں پر عام طور سے ایک آدمی جاکر
کچھ کھا پی سکتا ہے۔ ورنہ وائسرائے بہادر۔ یا ہر ہٹلر۔ یا مسٹر مسوکا اور مسٹر روز ویلٹ نے ہمیں اپنے ہاں کبھی کھانے پر بلایا۔
معاف کیجئے گا۔ میں کہاں سے کہاں۔۔۔ جا پہنچا۔ بات ایسی ہے کہ برا ہو اس جنگ کا بموں اور مشین گنوں کے ڈر کے مارے
خیالات کسی ایک جگہ نہیں رہتے اس لئے ہمارے خیالات بھی بھٹک گئے۔ کہاں غالب کا شعر کہاں باورچی خانہ۔
بس انتہا ہو گئی۔۔۔۔۔ یہ جنگ اور نہ ہوتے ہمارے خیالات اس قدر پریشان اور پراگندہ۔ جی تو عرض کرنے کا
مطلب یہ تھا کہ دوست دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مطلبی اور دوسرے غیر مطلبی۔ جتنے غیر مطلبی ہوتے ہیں وہ تو کھرے گھاٹ
دوڑ۔۔۔ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی مسٹر ہم کو یہ بات پسند ہے اور اس بات سے ہم ناراض ہیں مانتے ہو مانو ورنہ جاؤ۔
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔ ہمارا راستہ یہ رہا اور تمہارا وہ۔ تو جناب ہماری تو دعا یہ ہے کہ ایسے لٹھ مار خاں اور جھوٹ خان خاں
دوست سے خدا بچائے۔ بھلا کیا فائدہ ہوا۔ مولانا اپنی ہی اکڑ میں رہتے ہیں۔ جی ہاں اینٹ کی طرح سر پر دے مارتے ہیں۔
جی جناب ہم کسی کے دبیل نہیں۔ اور نہ کسی کا کیا دیا کھاتے ہیں۔ جو کسی کی گرم سرد سنیں۔ ہم تو اللہ لگتی کہتے ہیں۔ دیکھ لیا
آپ نے بے غرض دوستی کو۔ گویا دوستی کیا ہے۔ آؤ سے کی اجارہ داری ہے۔ اور اچھا خاصا کھکڑ پن۔ اللّٰھم حفظنا من کل بلیات۔

اب آیئے غرض مند دوستی پر۔ تو جناب غرض مند دوستی کا مطلب یہ ہے کہ آپ سے دوستی اس لئے کی جائے کہ
کچھ غرض پوری ہو۔ عام طور پر عوام الناس شاید اس دوستی کو برا سمجھیں اور سچ پوچھئے تو سطح النظری میں برا سمجھنے کی چیز بھی ہے۔
لیکن چشم بینا رکھنے والے اور عاقلان را اشارہ کافی است والے معاملے یہیں پر پورے ہوتے ہیں۔ غور کیجئے کیا بچوں کی
محبت اپنے والدین سے بے غرض ہے۔ حالانکہ بچوں کو دنیا میں اگر کسی سے سچی محبت ہوسکتی ہے تو وہ والدین ہیں۔
دنیا میں بچے کا بہترین دوست مربی اور بہی خواہ ہوسکتا ہے۔ تو والدین۔ مگر یہاں پر بھی مطلب لگا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو اردو
کی پہلی کتاب پہلا سبق وہی۔ ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ حقہ پی رہا ہے۔ آگے یاد کرو ہجے اور معنی۔ مگر یہاں پر
بھی مطلب لگا ہوا ہے۔

آمدم برسر مطلب جوان آدمی کو دنیا میں سب سے پیاری چیز بیوی ہے۔ اس کی سند چچا غالب کے ایک لطیفے سے مل
جاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت کہیں تشریف لے جارہے تھے کسی نے آپ کو ماں کی گالی دی۔ ساتھیوں کو غصہ آنے لگا۔ اور
کہنے لگے بھی عجیب آدمی ہو وہ آپ کو ماں کی گالی دے رہا ہے اور آپ ہنس رہے ہیں تو غالب صاحب نے اطمینان سے
ہنستے ہوئے جواب دیا۔ بھائی میں اس شخص پر کیا بگڑوں اس کو تو گالی دینے تک کی تمیز نہیں۔ گالی دینا بھی تو ایک فن ہے
فن داں اگر گالی دیتا تو تکلیف ہوتی ہے۔ گالی کے تین مدارج ہیں۔ بچوں کو ماں پیاری ہوتی ہے۔ اگر کسی بچہ کو ماں کی گالی
دے بچائے تو وہ اپنے سے باہر ہو جائے گا۔ جوان آدمی کو دنیا میں سب سے پیاری چیز بیوی ہے۔ اُسے بیوی کی گالی دو تو وہ

بگڑ اُٹھے گا۔ بڑھے کیلئے بیٹی دنیا کی سب سے بڑھ کر عزیز چیز ہے۔ اب آگے جانے دیجئے ہمیں تو اپنے کہے کی سند کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ہم نے ثابت کر دیا کہ جوان آدمی کو بیوی پیاری ہوتی ہے۔ اب ہے اجازت آگے بڑھے چلنے کی۔۔۔۔۔

اب ذرا ان کی دوستی محبت چاہت۔ اور عشق کی بھی داستان سُن لیجئے۔ اور غور کا مقام ہے ذرا کچھ سوچئے۔
دو ہستیاں جو ایک دوسرے سے علیٰحدہ رہیں علیٰحدہ بڑھیں۔ اور علیٰحدہ ہیں۔ جب ان کو قاضی جی من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی کر کے بندھن میں گانٹھ دیتے ہیں۔ تو اس میاں بیوی راضی تو کیا کریں بھیا قاضی والے قصے کے بعد سے ان دو رقیبوں میں محبت اور عشق کا ایک اتھاہ سمندر موجیں اس زور سے مارنے لگتا ہے کہ خدا کی مہربانی سے عموماً دسویں ورنہ گیارھویں مہینے میں محبت کا جیتا جاگتا ٹیں ٹیں کرتا سارے خاندان والوں کا دماغ ناک اور کان کے رستے پانی بنا کر نکال دیتا ہے۔ مگر ذرا غور کیجئے گا یہ یگانگت یہ دوستی یہ یک جہتی یہ محبت کیا بلاغرض ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی سے کس قدر زیادہ اغراض وابستہ ہیں۔ میاں کما کر لاتا ہے۔ بیوی کو دیتا ہے۔ بیوی کا دن رات ساڑیوں کا سوال وہ بھی محبت بھرے الفاظ میں اور اٹھلاتے ہوئے۔ نخروں سے ہلکی سی رونی صورت بنا کر خفگی کی دھمکی دے کر ہائے رے قسمت بتلایئے اب کونسی بے غرضی باقی رہی۔ لیکن یہ دوستی غرض مندی کی ہونے کے باوجود بھی دوسری سب دوستیوں سے اعلیٰ ارفع اور ہزار درجہ بہتر ہے۔ ایسا کیوں۔ اس لئے کہ یہ بے غرض دوستی نہیں۔ بلکہ باغرض ہے۔ اور یہی دوستی کام کی بھی ہے۔ بے غرض دوستی عموماً بیوقوفوں کی ہوتی ہے۔ باغرض دوستی تہذیب تمدن۔ شرافت اور نجابت کی ٹھیکیدار ہے

چلیئے اب پھر مصرعہ اولیٰ پر غور کریں۔ کہاں کی دوستی ہے بنے ہیں دوست ناصح معلوم ہوتا ہے۔ مرزا غالب کے جس قدر دوست تھے وہ بالکل بے غرض تھے اور کوئی باغرض تھا ہی نہیں۔ اور اگر باغرض تھے بھی تو۔ وہ کیسے کڑوے قسم کے ہوں گے۔ کیونکہ دوست وہ بھی باغرض دوست جب کسی اپنے دوست یا محبوب کو کچھ کہتا ہے تو ایسے میٹھے الفاظ میں کہ سننے کو جی چاہے بلکہ بعض اوقات تو لپک کر منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن دوست ناصح ہو ہے وہ بھی نصیحت کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور یہ بیہودگی عموماً ایسوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو کامل بلکہ اکمل سمجھتے ہوں۔ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ جو اپنے آپ کو کامل سمجھے وہی پرلے درجہ کا بیوقوف ہوتا ہے۔ اسی لئے تو یہ مثل مشہور ہے کہ دوسروں کی دولت اور اپنی عقل لوگوں کو عام طور پر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اور ایسے نصیحت کرنے والے کو اگر چھینکے پر بٹھا کر نیچے ناچ کیا جائے تو نتیجہ بے حد پُر لطف رہے گا۔ یقین نہ ہو تو آزما دیکھئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نوشہ کو بھی چھینکے قسم کا کوئی ناصح مل گیا تھا۔ مرزا غالب کھلے بندوں شراب پیتے تھے اور ناصح شاید چوری چھپے۔

اس لئے مرزا غالب نے خود ہی کہا ہے۔ ہم تجھے ولی سمجھتے گر نہ بادہ خوار ہوتا۔ کیونکہ پینا بھی کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ اس کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہے۔ اب ایسے شخص کی نصیحت ہی کیا۔ اور اس نصیحت کا اثر کیا۔ آیا آپ کی سمجھ میں۔ نصیحت یا پند کا وہی شخص اہل ہے یا تو جس نے اس کام کو سرے سے کبھی کیا ہی نہ ہو۔ لیکن ان دونوں کے

ہیں مین کا شخص بھلا کیا نصیحت کر سکتا ہے ۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اسی لئے خیرالامور اوسطہا والا معاملہ آجکل ہمارے حساب غلط ہوتا نظر آتا ہے۔ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ یہی کہ اس پار یا اس پار ۔

مصرعہ اولی کی تشریح معہ تمثیلات کردی گئی۔ اب ایک کر ذرا مصرعہ ثانی کو بھی دیکھ ڈالیں کہ اس میں کیا کیا گلکاریاں ہیں فرماتے ہیں۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا ۔ یہ مصرعہ بذات خود مصرعہ ثانی کی توجہ میں ہے ۔یعنی یہ کہ خالی خولی تمنح ناقد اور واعظ بننے سے کیا فائدہ ۔فائدہ تو اس وقت ہوتا جب آپ خشک تلخ کڑوی نصیحت کرنے کے بعد کچھ چرندم خرندم کا انتظام کرتے ۔ چارہ کے معنی تو بالکل صاف ہے ۔ دانہ چارہ عام طور پر کہا ہی جاتا ہے ۔ اور لفظ چارہ دانے کا تابع مہمل ہے ۔مثلاً گپ شپ بات چیت پانی وانی۔ روٹی کوٹی ان سے یعنی جو الفاظ دوسرے الفاظ کے تابع ہوتے ہیں وہ حقیقت میں پہلے لفظ کے معنی کو اُجاگر کرتے ہیں۔ دانے کا لفظ عام طور پر ... تہذیب کے تحت انسان کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا ۔لیکن مقصد بھی نکالنا ضروری ٹھیرا پھر مرزا غالب جیسا بیدار مغز۔ اور تپال تک کی خبر لانے والا شاعر ایسے ... سے کیسے نکلتا۔ انہوں نے جلدی سے ترکیب یہ کی کہ تابع مہمل کو معنی دار بنا کر اپنا مطلب نکال لیا۔ شاعروں نے زبان میں مراعات ایسی ہی پائی ہیں داد دیجئے اسی فہم فراست اور عقل کی کہ کیا باریک نکتہ نکالا ہے ۔ بس یہ حق غالب ہی کا تھا ۔کوئی بھلا اب کیا کہا گر ایسے اشعار لکھ پائیگا۔ (یہ الفاظ میرے نہیں ایک بڑے بزرگ کے ہیں اس لئے مجھے معذور سمجھا جائے۔) اور جناب پھر لطف یہ کہ اگر چارہ خالی خولی ہو ۔ . تو گھانس یا پات ہوکر رہ جائے ۔ اور گھانس پات انسان کھاتا نہیں اور اگر گھانس پات کھاتا بھی ہے تو شکل بدل لیتا ہے ۔مثلاً پالک ۔ساگ ۔ پودینہ ۔ . . . اناڑے کی بھاجی ۔کشمیر والوں کی چوب ڈل ۔ گھویاں یعنی اروی کے پتے ، مولیوں اور گاجروں کے پتے ۔ اب خود بھی خدا لگتی کہیئے یہ گھانس پات نہیں تو اور کیا ہے ۔لیکن اس گھانس پات کی شکل بدلنا ضرور رہوا ۔ اور شکل بدلی جا سکتی ہے صرف پکانے سے اور پکاتا کون ہے باورچی یا ماما ۔ تو یہاں پر چارہ ساز یعنی چارہ کو بنانے والا یا والی جیسا موقعہ ہو ۔ اور عموماً شمالی ہندوستان میں کھانا پکایا اور بنانا ۔ . الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب کھانا بن سکتا ہے تو یہ تو سیدھا سادھا فلسفہ ہے کہ کھانا بنانے والا یا والی بھی ہوگئی ۔ یہ والا اور والی کون ہو سکتے ہیں سیدھی سیدھی وہی مرغ کی ایک ٹانگ باورچی یا ماما حق غمگساری ادا نہیں کر سکتے ۔ اس قصے سے باورچی کو تو دیجئے اب طلاق رہ گئی ماما ۔ تو کبھی کبھی اسے غمگساری کا درجہ دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ کچھ ہو ــــ ملاحظہ ہو ۔حالات ہندوستانی گھر جہاں جوان آدمی رشتہ داروں سے علٰحدہ رہتے ہوں ۔صفحہ ۳۴۵ جلد دوم طبع چہارم اور اس معاملہ میں عموماً دنیا والوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اور یاران طریقت بھی غیر کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کے مصداق دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں چرا جاتے ہیں ۔ بات کڑوی ہے مگر ہے سولہ آنے سچی ذرا سطح سے مٹی کرید کر دیکھنے کی ضرورت ہے یہ تو ہوئی وہ رفاقت یا غمگساری جو آقا اور ماما کے سلسلے میں حاصل ہوتی ہے ۔ یعنی ایک پنتھ اور دو کاج ۔ اسی لئے

کسی کویراج نے شاید کہا تھا۔

اب رہ گیا دوسرا معاملہ یعنی غمگساری کے ساتھ چارہ سازی۔ یوں تو امیروں کی دنیا نرالی ہے اس لئے کہ ان کے گناہ ثواب جرائم ہیں بانصاف۔ اور روپیہ چال چلن کا ستر پوش ہے۔ وہاں اکثر ماما بیوی اور بیوی ماما بن جاتی ہے۔ لیکن یہاں تو ذکر ہے متوسط طبقہ کا جس سے مرزا غالب تعلق رکھتے تھے۔ اور جہاں روپیہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مثلاً چارہ سازی اور غمگساری کا ملا جلا کام صرف ایک ہی نہیں کر سکتی ہے۔ وہ ہے بیاہتا بیوی وہ بھی ہندوستانی شریف گھرانے کی لڑکی۔ شریف گھرانوں میں بھی متوسط طبقہ والی ورنہ بیگم صاحبہ کا وقت پلنگ پر بیٹھا لیا کرتے ہی گذرتا۔ بیبیا پھیر تھو تھیپٹر اور گالی گلوچ میں۔ مطلب عرض کرنے کا یہ تھا کہ متوسط طبقے کی شریف گھرانے والی بیوی غمگساری کا فرض بھی ادا کرتی ہے۔ اور کھانا وانا بھی بنا لیتی ہے۔ اس لئے مرزا غالب نے کہا ہے کہ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا۔ جبتک پیٹ میں روٹیاں نہ ہوتی تو سارا کھیل عشق دوستی اور محبت کا ادھر بیچ میں لٹکتا رہ جائے۔ اسی لئے انہوں نے کھانا بنانے والے معاملے کو پہلے رکھا اور غمگساری کو دوسرا درجہ دیا۔ سارا جھگڑا اسی مطلب کا ہے کہ انسان شادی کرے تو پھر دوست ناصح کھانا بنانے والی اور شریک غم سب یکجا اور یکدم ہی مل جاتے ہیں۔ تو حضرت مقصد مرزا غالب مرحوم کا اس شعر کے لکھنے سے یہ تھا کہ ایک مدد بیوی ہونی چاہیئے اور چونکہ اس شعر سے پتہ چلتا ہے بیوی کی کمی کا لہذا ثابت ہوا عقلی . . . نمبر ۲۵ سے کہ غالب صاحب کے اس وقت تک بیوی نہیں تھی۔ اور انہوں نے یہ بیوی کی کمی محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا۔ مختصراً سارے شعر کا مطلب ہے ہلئے "بیوی"۔

از ارشاد بی پی سی۔

شب ماہ

از سحر صہبائی

یہ باغِ قدرت　یہ بزمِ فطرت　یہ چاندنی رات　خاموش و ساکت
دنیا نہیں ہے ٭ جنت ہے جنت

چھائی جہاں پر　ایک بیخودی سی　خاموشیوں میں　ہے بیکلی سی
نظمِ دو عالم ٭ درہم برہم

مدہوش بادل　دوشِ ہوا پر　اُڑنے لگے ہیں　مخمور ہو کر
پُر کیف منظر ٭ فردوس دربر

الفت کے بندے　طالع پر اپنے　اترا رہے ہیں　جوشِ جنوں سے
نازاں ہیں کتنے ٭ شاداں ہیں کتنے

پُر درد نغمے　یوں گا رہے ہیں　گویا جہاں کو　بہلا رہے ہیں
نغمہ نہ کہہ تو ٭ جادو ہے جادو

دل میں اُمنگیں　آنکھوں میں مستی　کھوئی ہوئی سی　ہے ساری ہستی
روئے قمر تک ٭ حدِ نظر تک

نغماتِ بہجت　شیریں زباں پر　اُف بارِ الفت　مجھ ناتواں پر
مدہوش ہوں میں ٭ خاموش ہوں میں

لب پہ تبسم　دل میں طلاطم　رنگیں تکلم　شیریں ترنم
شب ماہ ایسی ٭ کس نے ہے دیکھی

انصاف

(۱)

اکبر کے تخت پر عالمگیر جلوہ افروز ہے۔ ہر طرف عدل عالمگیری کا ڈنکا بج رہا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔ زبردست زیر دست کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کہ اتنے میں خادمان سلطنت کو اطلاع ملتی ہے کہ سنبھاجی نے سورت کو لوٹ لیا اور حاجیوں کے قافلے کو غارت کر دیا۔ خبر کے ملتے ہی جلال عالمگیری نے اپنا رنگ دکھلایا۔ فوراً حکم ہوا کہ شاہی لشکر اس نابکار کو قرار واقعی سزا دینے کے لئے دکن روانہ ہو۔

اس مرتبہ اورنگ زیب نے فوج کی کمان اپنے ہاتھوں لی۔ اس لئے کہ وہ سنبھاجی کے سلسلے میں سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کو بھی یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ عدد خلافی اور سلطنت مغل کے دشمنوں کا ساتھ دینے کا کیا نتیجہ ہوا کرتا ہے چنانچہ فوجیں کوچ کرتی ہوئی برہان پور پہنچ گئیں۔ اور شاہی لشکروں نے اس مقام کو مرکز بنا کر دشمنوں کا مقابلہ شروع کر دیا۔

اس وقت عالمگیر کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی۔ لیکن رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے امراء اور شاہزادے اس کے سامنے آتے ہوئے کانپتے تھے۔

پہلے اورنگ زیب نے بیجاپور پر ہاتھ ڈالا۔ یہاں کا بادشاہ سکندر عادل ایک مجہول حکمران تھا۔ سلطنت پر امراء کا قبضہ تھا۔ جو آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ ملک کی حالت سے مرہٹے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور پوری سلطنت بیجاپور میں ایک ہنگامہ بدتمیزی پھیلا ہوا تھا۔

اورنگ زیب نے اپنی فوجیں بیجاپور پر بڑھائیں تو مرہٹے اور بیجاپوری سپاہی ان فوجوں کا مقابلہ کرنے کو دوڑ پڑے۔ لیکن جب ملک میں انتظام نہ ہو اور ملک عنبر جیسا سپہ سالار ان فوجوں کو لڑانے والا نہ ہو تو یہ فوجیں کیا بھڑ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سکندر عادل کی فوجیں پیچھے ہٹنے لگیں۔ یہاں تک کہ بیجاپور کا محاصرہ ہو گیا۔ اور ایک سخت جنگ کے بعد بیجاپور کے بادشاہ نے اپنے آپ کو اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔

شاہی فوج اس فتح کی خوشیاں منانے لگی اور اورنگ زیب برہان پور لوٹا تا کہ گولکنڈہ پر حملے کے لئے اپنی فوجیں ترتیب دے۔

رات کا وقت تھا۔ تمام سردار گولکنڈہ کی مہم کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے شاہی خیمہ میں اکٹھا تھے

بڑی رات گئے تک یہ مشورہ ہوتا رہا۔ آخر دربار برخواست ہوا اور شاہنشاہ آرام کرنے کے لئے سراپردہ میں چلا گیا۔ کہ اتنے میں خیمہ کے دروازہ پر ایک شخص گرد میں اٹا ہوا پہنچا اور باریابی کی اجازت چاہنے لگا۔ سنتری نے کہا جہاں پناہ ابھی ابھی آرام فرمانے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ اس وقت باریابی ممکن نہیں۔

مسافر۔ میں اسی وقت قدمبوسی کی عزت چاہتا ہوں۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ جہاں پناہ کو اگر خبر ہوگئی تو وہ اپنے آرام کا خیال نہ فرمائیں گے اس لئے کہ وہ اورنگ زیب ہیں۔ انہیں اپنے آرام سے زیادہ اپنی رعایا پیاری ہے۔

سنتری اور مسافر کی گفتگو تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک آواز سراپردہ تک پہنچی۔ تو جہاں پناہ نے ایک خادم کو دریافت حال کے لئے باہر بھیجا۔ اس نے اندر واپس جاکر اطلاع کی کہ "جہاں پناہ کا اقبال زیادہ ہو۔ ایک مسافر گرد میں اٹا ہوا۔ باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ سنتری اسے روک رہا ہے وہ ضد کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

(۲)

شاہنشاہ ہند برآمد ہوتے ہیں۔ اور مسافر سے استفسار فرماتے ہیں۔ اتنی رات گئے تم کہاں سے آرہے ہو اور اس وقت باریابی حاصل کرنے کی کیوں اجازت چاہتے تھے۔

مسافر نے آداب و کورنش عرض کرنے کے بعد دست بستہ عرض کیا کہ جہاں پناہ میں اٹاوہ کا رہنے والا ہوں۔ مجھ پر اور ایک بیوہ و یتیم لڑکی پر اٹاوہ کا کوتوال بڑا ظلم کر رہا ہے۔ میں نے قاضی شہر سے فریاد کی لیکن اس نے میری التجا و فریاد پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس لئے حاضری کی عزت حاصل کرنے اور فریاد کرنے جہاں پناہ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ جہاں پناہ ہم تینوں کی زندگی کا انحصار اب جہاں پناہ پر ہے۔"

اس کے بعد اس نے چپکے چپکے شہنشاہ سے کچھ عرض کیا۔ اس کی گفتگو کے بعد عالمگیر نے کہا اچھا تم جاؤ میں وقت مقررہ پر اس معاملہ کا تصفیہ کر دوں گا۔ لیکن اگر تمہارا بیان غلط ثابت ہوا تو اس غلط بیانی کی تم کو سخت سزا دی جائیگی

مسافر سینہ پر ہاتھ رکھکر جھک گیا۔ اور شہنشاہ ہند دوبارہ آرام کرنے کے لئے اندر تشریف لے گئے۔

۔ "ہے ہے کیا غضب ہے۔ ایسا اندھیر تو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس موئے کوتوال کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے میں تو جیتے جی یہ نہ ہونے دوں گی۔ عزت پر آدمی جان دے دیتا ہے وہ سمجھے ہوئے ہے کہ خدائی اس کے بس میں ہے لیکن بیکسوں کا حامی و مددگار وہ ہے کہ جس نے امیر و غریب کو پیدا کیا ہے۔

یہ الفاظ ایک ضعیفہ کی زبان سے نکل رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ اس کی ایک لڑکی تھی۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے پورے شہر میں مشہور تھی۔ ضعیفہ نے اس کی نسبت اپنے خاندان کے ایک نوجوان لڑکے سے کی تھی۔ جو ہر طرح اس لڑکی کے لائق تھا۔ لیکن اس لڑکی کے حسن کی شہرت کوتوال شہر تک پہنچ چکی تھی۔ جو ایک بوالہوس انسان تھا۔ اس نے

یہ سمجھ رکھا تھا کہ اس بے بس عورت کی فریاد کو کون آ سکے گا۔ اس نے اپنی طرف سے ایک شاطہ کو اس عورت کے پاس بھیجا کہ اس کو اپنی دامادی میں قبول کرے۔ لیکن بڑھیا نے اس شاطہ کو جھڑک دیا۔ اور اس کے ساتھ کوتوال صاحب کی شان میں بھی چند سخت سست کلمات کہدیئے۔

لیکن کوتوال صاحب یوں ہار ماننے والے نہ تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے عہدہ کا اس پر کچھ اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ تو دولت کی لالچ دی۔ اور ایک دوسری عورت کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ میں تم کو مالا مال کردوں گا آیندہ زندگی تمہاری بڑے عیش و آرام میں گذرے گی۔ لیکن بڑھیا نے ناکہہ کے ہاں نہ کہی۔

جب کوتوال نے دیکھا کہ بڑھیا مانتی نہیں تو اس لڑکے کا پیچھا کیا کہ جس کے ساتھ نسبت قرار پائی تھی ایک دن کوتوال نے اسے بلایا اور کہا کہ اگر تم اس لڑکی سے عقد کرنے سے انکار کرو تو میں تمہیں ایک اچھا عہدہ دیدوں گا۔ لیکن کوتوال صاحب کو خبر نہ تھی کہ چند چیزیں انسان کے قابو سے باہر ہیں یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اتار دے۔ اس نے جواب دیا کہ جناب یہ بات ناممکن ہے۔ میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ لیکن یہ بات جو آپ چاہتے ہیں نہیں ہوسکتی۔

جب کوتوال صاحب کو یہاں بھی ٹکا سا جواب ملا تو انہیں بڑا غصہ آیا۔ اب ہر طرح سے ان لوگوں کو ستانا اور پریشان کرنا شروع کردیا۔ لیکن کھلم کھلا وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے کیوں کہ ہندوستان کی سلطنت کا مالک اورنگ زیب تھا۔

اس نوجوان نے جب یہ دیکھا کہ کوتوال پر بھوت سوار ہے اور وہ ہر طرح درپے آزار ہے تو اس کے دل میں آئی کہ اب چل کر اس معاملہ کی شہنشاہ سے ہی فریاد کی جائے۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس زمانہ میں جہاں پناہ دہلی میں نہیں بلکہ برہان پور میں قیام فرما ہیں۔ چنانچہ ایک رات وہ چپکے سے برہان پور روانہ ہوگیا۔ جہاں ہم نے اُسے باریابی کی کوشش کرتے ہوتے پہلے ہی بتلا دیا ہے۔ یہی امر تھا کہ جس کے لئے وہ باریابی چاہتا تھا۔ اس لئے کہ عقد کی مقررہ تاریخ پر کوتوال نے یہ کہا تھا کہ وہ زبردستی کرے گا۔

قاضی صاحب نے بھی بحیثیت ایک عہدہ دار سلطنت کوتوال کا ساتھ دیا۔

(۴)

عقد کی تاریخ آگئی۔ وہ نوجوان دولھا بنا ہوا لڑکی کے گھر پہنچا۔ ابھی اس کو پہنچے دیر نہ ہوتی تھی کہ کوتوال صاحب بھی دولہا بنے ہوئے آپہنچے۔ لیکن ابھی قاضی صاحب نہ آئے تھے انہیں کا انتظار تھا۔ مردانے حصہ میں تو یہ دو دولہے بیٹھے ہوئے تھے اور زنانی حصہ میں کوتوال صاحب کے آتے ہی کہرام مچ گیا۔

لڑکا بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے آنے کا انتظار

بڑی بے چینی سے کر رہا ہے۔ اتنے میں قاضی صاحب بھی آ گئے۔ اور اب وکیل و گواہ آگے بڑھے تاکہ عقد کے مراحل طے ہوں کہ اتنے میں ایک شخص گرد و غبار میں لپٹا ہوا آ کر اس محفل میں شریک ہو گیا۔ جیسے ہی نوجوان نے اس بڈھے کو دیکھا اس کے چہرے پر ایک طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

کہتے ہیں کہ بدنفس لوگ اندھے ہوتے ہیں۔ یہ قول صحیح ہو یا غلط لیکن اس موقع پر صحیح ہی نکلا کہ کوتوال صاحب اور قاضی صاحب دونوں بھی اندھے بنے ہوئے تھے۔ جب انتخاب وصول ہونے لگا تو اس مسافر بڈھے نے گرجدار انداز میں کہا ٹھیرو۔ اس آواز کا آنا تھا کہ کوتوال اور قاضی دونوں کے اوسان خطا ہو گئے اور لگے تھر تھر کانپنے۔ خود غرضی و بوالہوسی نے ان کو اس بات کا موقع ہی نہ دیا تھا کہ وہ یہ دیکھتے کہ اس محفل میں کون آ کر شریک ہوا تھا وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہمارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

اس بڈھے نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ اس لڑکی کا ولی کون ہے۔ ایک شخص نے جواب دیا کہ اس کی بیوہ ماں اس کی ولیہ ہے۔ اس پر بڈھے نے کہا اسے بلاؤ۔ نوجوان نے آگے بڑھ کر ضعیفہ کو بلایا اور کہا کہ جہاں پناہ تمہارے گھر تشریف لائے ہیں اور تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔ بڑھیا دوڑی ہوئی آئی۔

اورنگ زیب:۔ تم اپنی لڑکی کا عقد کس کے ساتھ کرنا چاہتی ہو۔ کوتوال شہر کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ۔

بڑھیا:۔ جہاں پناہ میں اپنی لڑکی کا عقد اس نوجوان کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں جو جہاں پناہ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔

اورنگ زیب:۔ اچھا تم اپنی لڑکی بلاؤ۔

تھوڑی دیر میں کپڑوں میں لپٹی لپٹائی ایک لڑکی بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی اور اورنگ زیب نے کہا تم کوتوال شہر سے اپنا عقد پسند کرتی ہو یا کسی اور سے۔

لڑکی:۔ جہاں پناہ میں اس نوجوان سے عقد پسند کرتی ہوں جسے میری ماں نے میرے لئے پسند کیا ہے۔

اورنگ زیب نے یہ سن کر قاضی کو حکم دیا کہ وہ عقد پڑھائے۔ جب عقد ہو چکا تو اورنگ زیب نے حکم دیا کہ کوتوال کو گرفتار کر کے جیل میں تا حکم ثانی بند کر دیا جائے اور قاضی شہر کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ مابدولت نے تمہیں اس لئے یہ عہدہ دیا تھا کہ میری رعایا میں انصاف کرو گے اور کسی پر ظلم نہ ہونے دو گے۔ لیکن مابدولت کو یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ تم نے اپنے فرائض سے کوتاہی کی۔ اس لئے تم کو برطرف کیا جاتا ہے۔ اور آئندہ سے تمہارے خاندان کا کوئی فرد اس عہدہ پر فائز نہ ہو سکیگا۔

اس نوجوان سے مخاطب ہو کر حکم دیا کہ آج سے تم اس شہر کے کوتوال ہو لیکن دیکھنا کہ تمہارے قدم اپنے فرائض سے نہ ڈگیں ورنہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا۔ جو اس کوتوال کا ہوا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا ایک تیز رفتار سانڈنی پر جنوب کی طرف ایک سوار اڑا چلا جا رہا ہے۔ جس کے پیچھے گرد کا غبار دور تک اٹھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

یہ تھا عالمگیری انصاف۔

م۔ احمد۔ بی۔ اے

خودکشی

دنیا اور دنیا والوں سے بیزار ہو کر۔ اب وہ دونوں کو خیرباد کہہ رہا تھا خدا کی تمام کائنات کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ وہ ان سب سے نفرت کرتا تھا۔ مگر پھر بھی آج وہ ان سب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے دل میں ان میں سے کسی ایک کی خواہش کر رہا تھا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ وہ باوجود تلاش ہونے کے اپنے میں احساس رکھتا تھا ۔۔ احساس حیات۔

وہ آجکل ہی کی دنیا کا ایک نوجوان تھا۔ اور عام نوجوانوں کی طرح کالج کی چہار دیواری میں ترقی اور عروج کے میٹھے میٹھے خواب دیکھتا رہا تھا۔

لیکن اب اس کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ چہرہ دروں با خود تصانہ رویہ [illegible] بیکاری جب پیٹ کی محتاجی۔ اس کو مایوسی کے بھنور میں دھکیل چکے تھے۔ اس کے سب ارمان۔ خاکستر ہو کے رہ گئے تھے۔ اس کا دل مردہ ہو چکا تھا۔ اب وہ ہر قسم کی توقعات سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ انتہائی مایوسی نے اسے اپنے آپ سے متنفر کر دیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا۔ کہ دنیا صرف تمول کی تفریح گاہ ہے۔ غربت کے لئے اس کی دنیا کا ایک کونہ بھی باعث سکون نہیں ہو سکتا۔

اس کا مردہ دل موت کے انتظار میں دن کاٹ رہا تھا ۔۔۔ مگر وہ بھی نہ آتی تھی انہیں دنوں کسی کی ترچھی نگاہوں۔ اور مسکراہٹ نے اس کے دل کو زخمی کر دیا تھا۔ محبوب نے اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ دینے کا وعدہ کیا، امیدیں دلائیں۔ وہ اس کے سہارے جینے لگا۔

لیکن ایک غریب۔ اور بے بس انسان کے جذبات [illegible] کی محبت کی کتنی وقعت ہو سکتی ہے۔ چند روز بعد ہی اس کو معلوم ہوا کہ اس کے محبوب نے دل بدل لیا۔ اس نے اپنے تمام وعدوں کو طاق نسیاں کر دیا۔

اس کا ٹوٹا ہوا دل ابھی پوری طرح جڑنے بھی نہ پایا تھا کہ جوڑنے والے نے ہی اُسے اپنے ہاتھوں سے پاش پاش کر دیا۔ اس نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی کشتی طوفان کی زد سے بچانے کے لئے جس ناخدا کے ہاتھوں میں دی تھی، وہی ناخدا اسے کشتی کو گرداب میں پھنسا دیا۔ اور خود محفوظ ہو کر تماشہ دیکھنے لگا۔ اس بدوقت ٹھوکر نے اُسے دوبارہ مایوس کر دیا۔ اس کی زندگی اس کے لئے اجیرن ہو گئی۔ وہ اپنی ناکامیوں پر آنسو بہاتا ہوا۔ ایک عالم بے خیالی کے عالم میں۔ دریا کی طرف چلنے لگا۔

یونہی وہ چلتے چلتے دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ چند سیکنڈ تک اس کا ضمیر نفرت و اُمید کی کشمکش میں رہا۔ مگر حالات کی یاد نے نفرت کو غالب کر دیا۔ غیرارادی طور پر اوس کے پاؤں کنارے سے پانی تک بڑھ گئے وہ اوسی بے خبری میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ مبہوت و بے خبر بڑھتا چلا گیا ــــ یکایک اُس کے پاؤں پھسل گئے موجوں نے اُسے اپنے دامن میں لے لیا۔ اس کی آنکھیں از خود بند ہو گئیں۔ وہ بیہوش ہو گیا ــــ پانی کی روانی تیز ہو گئی تھی۔

وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا چلا گیا۔ کبھی کبھی اسے خواب کی طرح اپنے جسم میں شدید درد کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ اُسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کسی نے باندھ دیئے ہیں۔ باوجود کوشش کے بھی وہ اونہیں حرکت نہیں دے سکتا۔

وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی نہ معلوم طاقت اُسے زور سے کھینچتے لئے جا رہی ہے۔ اس کا سر چکرانے لگا اُس نے محسوس کیا کہ وہ عمیق ترین ــــ اور خوفناک گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اُس نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ اس کا جسم ٹھہر گیا۔ اسے دھندلی دھندلی روشنی نظر آنے لگی۔ اس نے ایسے نیم شفاف اُجالے میں دیکھا کہ وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ ایک نہ معلوم سی طاقت کے زیر اثر غیرارادی طور پر اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہو کر وہ گم سم اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر قد و قامت کے خوش وضع ہرے ہرے درختوں پر عجیب عجیب وضع کے خوبصورت رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جا بجا شفاف نہریں بہہ رہی تھیں۔ نوجوان وہاں کے سامان سے مرعوب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ خدایا یہاں کیا کچھ نہیں ہے اس نے اپنے دماغ پر زور دیا۔ اس کو وہ واقعات یاد آ گئے۔ جنہوں نے اس کی زندگی کی مٹھاس کو تلخی سے بدل دیا تھا۔

کتنی اچھی ہے یہ دنیا۔ ہماری دنیا سے کتنی مختلف - - - - - -

یکایک اس کی نظر باغ کے ایک کونے کی طرف گئی۔ لاتعداد مہوشوں کا غول ایک طرف سے آیا دوسری طرف جا کر اوجھل ہو گیا۔ ان گنت بجلیاں اس کی آنکھوں میں کوندھ گئیں۔ ذرا سی دیر کے لئے اس کی محبوبہ۔ بیوفا محبوبہ کا تصور اس کے ذہن میں آیا۔ مگر فوراً ہی غائب بھی ہو گیا۔ قدرت یہ چاہتی تھی کہ ایسے دلکش ماحول میں اُس کا ذہن کسی قسم کی اذیت میں مبتلا نہ ہو۔

"تم کون ہو"

کسی نے پیچھے سے آ کر کہا۔ اوس نے پھر کر دیکھا۔ ایک حوروش۔ نازک اندام نازنین اس کے سامنے

کھڑی ہے ۔ اس کا حسن کوہ قاف کی پریوں کو شرمار ہا تھا۔ نوجوان نے اپنی آنکھیں بند کرلیں وہ ان کے حسن کی تاب نہ لا سکتا تھا ۔

"کون ہو تم" اس نے دوبارہ پوچھا ۔

" ایک بدنصیب انسان ہوں ۔ اس نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔

" بدنصیب . . . . تمہارا یہاں کیا کام ہے۔

" جی نہیں کچھ بھی نہیں ۔ ۔ میں چلا جاؤں گا' یقین مانئے میں خود سے نہیں آیا ہوں ۔ مجھے زبردستی یہاں پہنچا دیا گیا ہے ۔ میں جانتا ہوں ۔ کہ یہ غلطی ہے ۔ یہ جگہ میرے لئے نہیں ہو سکتی بھلا ایسی چیزیں میری قسمت میں کیوں ہونے لگیں تھیں ۔ لیکن خدا کے لئے مجھے یہاں سے نہ نکلوایئے ۔ میں اس باغ میں اور دو لمحے گذارنا چاہتا ہوں ۔

" آپ یہاں ٹھہر سکتے ہیں ۔ نازنین نے کہا ۔ ہم آپ کو مہمان کی حیثیت سے اپنے پاس رکھیں گے ۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی — میں یہاں کی ملکہ ہوں

" م . . . . . م . . . ملکہ ہیں آپ یہاں کی ۔ یہ سب آپ ہی کا ہے ؟

" آپ کا بھی . . . . ——— کیا چاہیئے تم آپ کو ———

ملکہ کے تالی بجاتے ہی ۔ ایک پری جمال خادمہ حاضر ہو کر درباری آداب بجالائی " ان کی خاطر کرو " ملکہ نے حکم دیا "یہ ہمارے مہمان ہیں " خادمہ دوبارہ آداب بجالا کر چلی گئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دنیا نوجوان کے سامنے حاضر کر دی گئی پینے کے لئے شراب اور شہد و شربت ! کھانے کے لئے آم و انجیر اور امرود' انار و انناس و آڑو . . . . غرض کونسی چیز تھی جو وہاں نہ تھی سامنے کچھ لڑکیاں دف بجا بجا کر ناچ رہی تھیں ایک طرف ایک لڑکی میٹھے سروں میں کچھ گا رہی تھی —

نوجوان دیر کا بھوکا تھا وہ کھانے لگا ۔ ملکہ بھی اس کے قریب بیٹھ گئی ۔ یہ بینظیر ضیافت ختم ہونے پر نوجوان نے ملکہ کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی " کس قدر مہربان . . . مہربان ہیں آپ کس قدر ! کیا ایسی بھی کوئی دنیا ہو سکتی ہے کاش کہ اُس دنیا میں بھی لوگ ایسے ہی ہوتے ۔

" کیا بہت ستاتے تھے آپ کو یہ دنیا والے ' ملکہ نے پوچھا " آپ کی قدر وہ لوگ کیا جان سکتے تھے ۔

(ایک آہ بھر کر) میری قدر کون کرتا سچ پوچھئے تو کسی نے مجھے سمجھا ہی نہ تھا ۔ . . . سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی میرے گھر والے تک مجھے نہ سمجھ سکے تھے میں سمجھتا تھا کہ شاید ساری عمر دنیا کو سمجھاتے ہی سمجھاتے گزرے اور شاید . . . . شاید پھر بھی دنیا سمجھ نہ سکے — اس لئے میں ایک ہمہ گیر ہستی کے پاس پہونچنا چاہتا تھا ۔

میں اپنے خدا سے ملنے جارہا تھا ۔

"ڈوب کر"۔۔۔۔

"جی ہاں میں ڈوبتے جارہا تھا میں سمجھتا تھا کہ دریا کے لہروں کی آغوش میں میں میٹھی نیند سو سکونگا اور اسی نیند میں جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو۔ مچھروں کو اپنی اپنی کشتیوں میں بیٹھے بے فکری کے سازوں میں بہار کے' ساون کے اور پریت کے گیت گنگناتے ہوئے صبح و شام ادھر سے ادھر گزرتے ہوئے دیکھتا ان کے نغمے میرے لئے پیام مسرت ہوتے۔ میں سمجھ لیتا کہ دنیا اب پہلے سے بہتر ہے پہلے سے زیادہ خوش ہے اور اس خیال سے میں خوش ہوتا۔۔۔ اسی طرح ۔۔۔ بس اسی طرح سے دن بیت جاتے"

"لیکن پھر بھی وہ حرام موت ہوتی۔۔۔

(چونک کر)" حرام"!!! وہ لفظ اسے تکلیف دے رہا تھا" ہاں ہوتی" اس نے دبی آواز سے کہا۔ لیکن میں دنیا میں بہت سے گناہ کر چکا تھا اتنے زیادہ کہ ایک گناہ کا اضافہ اس ڈھیر میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں کر سکتا تھا اور پھر اس ایک گناہ سے نہ معلوم کتنے گناہوں سے نجات مل جاتی"

گذشتہ کی یاد نے اسے پھر سوچ میں ڈال دیا۔

شام کا سہانا وقت تھا ایک شرمیلی نازنین کی رخساروں کی طرح آسمان کا رنگ سرخ ہوتا جا رہا تھا بھینی بھینی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ساری فضاء مسرت کے گیت گا رہی تھی۔

لیکن وہ ابھی تک اپنے خیالات میں غرق تھا۔

"اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو ملکہ کو اس تکالیف کا احساس ہونے لگا۔

" دیکھئے ساری فضا مسرت کے گیت گا رہی ہے آپ بھی کچھ گایئے۔۔۔۔ نہیں گائیں گے آپ؟

اچھا تو پھر میں گاؤں گی ملکہ نے گانا شروع کیا ع موری بگیا میں آئے بلموا"

ملکہ گا رہی تھی سریلے نغمے نوجوان پر اثر کرتے جا رہے تھے اس کے قلب میں ایک نئی روح پھونک رہے تھے ملکہ کی جادو بھری آواز اس کے دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی وہ اپنی دنیا کو بھولتا جا رہا تھا۔

"اچھا گاتی ہیں آپ" گیت ختم ہونے پر نوجوان نے مسکرا کر کہا"۔۔۔ مانیے میں ایسا گانا اپنی عمر میں نہیں سنا ہے" میں نے آج پہلی مرتبہ دل سے گایا ہے آپ کے لئے ملکہ نے شرمائی ہوئی آواز سے زیر لب کہا "کہیئے آپ کو پسند ہے"۔

نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا وہ سوچ رہا تھا۔۔۔ خدایا! یہ کیف بھری دنیا یہ مستی بھری مسرت کاش کہ میں ہمیشہ یہاں رہ سکتا۔۔۔ اور پھر جیسے غیب سے کوئی روشنی دماغ میں آئی ہو دفعتاً نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا اور دو زانو ہو کر ملکہ سے التجا کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ملکہ بتایئے۔۔۔ مجھے بتایئے ملکہ خدا کے لئے کون ہے یہاں کا شہنشاہ'

اس باغ کا مالک اس فردوس کا والی ہے اس کے قدموں پر سر رکھوں گا اس کو اس کی عزیز ترین چیز کا واسطہ دے کر اس سے یہ التجا کروں گا، بھیک مانگوں گا وہ مجھے صرف اتنی اجازت دے بس میں یہاں رہ سکوں۔ یہاں کی خاک چھان سکوں میں اس کے عوض کٹھن سے کٹھن کام کرنے کو تیار ہوں"

یہاں کا کوئی شہنشاہ نہیں ہے " ایک وقار آمیز حسرت سے ملکہ نے کہا۔ اس باغ کا مالک اس کی ملکہ ہے اس کی بہترین چیز اس کا دل ہے تمہاری درخواست منظور کر کے ملکہ کو خوشی ہوئی"——

یہاں کا کوئی شہنشاہ نہیں ہے وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہا تھا" ملکہ ہی یہاں سب کچھ ہے۔ ۔ ۔ اور مجھے ملکہ کی اجازت ہے پھر مجھے کوئی نہ نکال سکے گا—— یہاں سے واقعی۔ ۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ خوشی کے ساتھ ساتھ اس کو کچھ شبہ سا ہو رہا تھا——

ملکہ اور اس کے قریب آگئی۔ بہت دنوں سے ان باغ والوں کا خیال تھا کہ یہاں کا کوئی شہنشاہ ہوتا وہ چاہتے کہ میرے دل کا مالک کوئی شہزادہ ہو میں چاہتی تھی کہ کوئی میرا ہوتا ہو—— اور میں اس کی پجارن —— ایک دلی جوش سے وہ کہے جا رہی تھی —— " وہ بے نیاز ہو وہ نرالا ہو اسے کوئی نہ سمجھ سکے صرف میں سمجھ سکوں اسے اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھاؤں میں اس پریم مندر کی تنہا پجارن رہوں۔ اس کے لئے پریت کے گیت گایا کروں چاندنی راتوں میں اس کے لئے۔ ۔ ۔ ۔

بس—— بس کرو ملکہ مجھے اپنے ہوش سنبھالنے دیجئے کیا یہ سب سچ ہو سکتا ہے الہٰی میں ایک بدنصیب انسان دنیا کا ٹھکرایا ہوا اس باغ کا اس فردوس کا مالک۔ ۔ ۔ ۔ شہنشاہ۔ ۔ ۔ ۔ دیوتا اس نے ایک مجنونانہ قہقہہ مارا اس کا سر چکرا رہا تھا۔

ہاں یہ سچ ہے" ملکہ نے تسکین دیتے ہوئے کہا " آج ہی رات کو ہماری شادی ہو جائے گی اور پھر آپ یہاں کے شہنشاہ ہو جائیں گے۔

" اور دیوتا کب سے نوجوان نے اسی جنون میں دریافت کیا۔

میں تو اسی وقت سے دیوتا مان چکی ہوں جب پہلی مرتبہ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔

وقت بہت ہو گیا ملکہ نے پھر سے کہا اب میں جاتی ہوں آپ تیار ہو جایئے جلدی کیجئے ورنہ اگر بارش ہونے لگی تو شادی نہ ہو سکے گی۔

وہ چلی گئی باغ میں چہل پہل مچ گئی دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

یہ بیٹھا بیٹھا سوچنے لگا۔ ۔ ۔ میں بھی کبھی اپنے پریم مندر میں ایک دیوی کو پوجتا تھا میں تنہا اس کی پوجا کیا کرتا تھا میں نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی مجھے فخر تھا کہ وہ میری دیوی ہے۔ ۔ ۔

اور میں اس کا پجاری لیکن آخر وہ پتھر کی مورتی ہی نکلی ۔ ۔ ۔ ۔ میرے تمام چڑھاوے تمام قربانیاں سب ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ بارش ہونے لگی یا!! یہ چونک پڑا گھبرایا ملکہ کی آواز اس کے کانوں میں بار بار آنے لگی "جلدی کیجئے جلدی کیجئے بارش ہونے لگے گی تو شادی نہ ہو سکے گی بارش ہوئی تو شادی نہ ہوگی بارش ہوئی تو ۔

باغ کی چہل پہل سب بند ہوگئی بجلیاں چمکنے لگیں بادل گرجنے لگے بارش اور تیز ہونے لگی باغ میں پانی جمع ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ پانی چڑھتا گیا آہستہ آہستہ باغ ڈوبتا گیا۔

نوجوان پوری کوشش سے ایک درخت کو چمٹا ہوا تھا وہ ڈوب مرنے کے لئے نکلا تھا لیکن اب وہ اس سے بھاگ رہا تھا مدت سے کچھ گھبرا رہا تھا ——— دفعتاً ایک بڑا ریلا آیا اور درخت اس کی تاب نہ لا سکا سہارا چھوٹنے پر نوجوان غوطے کھانے لگا جب وہ ڈوبنا چاہتا تھا تو قسمت اس کو بچا کر ایک باغ میں لے گئی ۔ اور جب کہ وہ اب بچنا چاہتا ہے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تقدیر اس کو ڈبا کر ہی چھوڑے گی ۔

وہ غوطے ہی کھا رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کے سر کے بال زور سے پکڑ لئے ہیں اور وہ گھسٹتا ہوا بہت تیزی سے کہیں چلا جا رہا ہے ۔

اسی تیزی سے وہ چلا جا رہا تھا اور اوس کے کانوں میں ایک پُراسرار آواز آ رہی تھی کوئی کہہ رہا تھا ۔ یہ دنیا انسانوں کیلئے نہیں ایسی خوشی کسی بھی انسان کے لئے نہیں ہوتی یہ محض ایک خواب کی دنیا ہے تم کو اپنی دنیا میں واپس جانا ہوگا اور وہاں پھر سے محنت کرنی ہوگی تمہاری دنیا آرام کی نہیں آزمایش کی ہے اس آزمائش میں جس کے قدم نہ ڈگمگائیں وہ اپنے لئے خوشیوں کی دنیا میں جگہ بنا لیتا ہے یہ کامیابی ہر کوشش کرنے والے کے لئے یقینی ہے تم یقین کھو چکے اس لئے ہم نے تمہیں اس کی ایک جھلک دکھلا دی ۔

اب تمہارے قدم نہ ڈگمگانے چاہئیں جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ جاؤ ——

وہ ساحل پر لیٹا ہوا تھا آہستہ آہستہ اس کو ہوش آ رہا تھا جب اس نے آنکھیں کھولیں تو دھندلے میں اس کو دو اشخاص نظر آ رہے تھے کچھ دیر بعد ان میں سے ایک نے کہا ۔

اللہ کا شکر ہے آپ بچ گئے میری بیوی نے پہلے آپ کو دیکھا آپ کی قمیص ایک درخت کی ٹہنیوں میں الجھی ہوئی تھیں میرے پہونچے پہونچے تک ایک بڑے ریلے میں آپ کی قمیص پھٹ کر درخت سے الگ ہوگئی اور آپ ڈوبنے لگے اتنے میں میں نے آپ کے لانبے لانبے بال پکڑ لئے ۔ تیرنا نہیں آتا تھا تو دریا میں آپ کیوں گئے "

کچھ دیر بعد بیوی نے پوچھا "جی نہیں تیرنا تو آتا ہے نوجوان نے کمزور آواز سے جواب دیا " لیکن بعض وقت ہاتھ پیر مارنے کو قسمت منع کر دیتی ہے " اور "دبا دیتی ہے" جی نہیں باغوں میں لیجاتی ہے ۔

اچھا چلئے ہم آپ کو گھر پہونچا دیں شوہر نے کہا "آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے"

جناب ایم ۔ اے ۔ شاکر رضا معصوم ۔ بی ۔ اے ۔ ایل ایل بی ۔

چار پر والی مکھیوں کا پھولوں سے تعلق

پھولوں اور مکھیوں میں عرصہ دراز سے جو قریبی تعلق رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان پھولوں نے مکھیوں کے عضویوں اور ان کے خواص پر اپنا اچھا خاصا اثر مترتب کیا ہے۔ ماہرین نباتیات کی رو سے متعدد پھول وضع قطع میں ترمیم ہو گئے ہیں اور ان کی ساخت یا رنگ و بو میں بھی واضح تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ بار ریزگی ہے جس کی خاطر مکھیوں کا ان پر آنا لازمی ہے۔ ان تعلقات پر ایک بسیط اور دلچسپ مضمون لکھا جا سکتا ہے لیکن میں اسے یہاں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دوں گا۔ ہم ان مکھیوں کے بیحد ممنون ہیں جن کی وجہ سے ہمارے پھلدار پودوں کی نشو نما زیرگی سے ہوتی ہے اور دوسرے معاشی پودے ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ بہرحال پھولوں سے ان مکھیوں کا جو تعلق ہے اس کے متعلق ہم کو کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ یہ تعلق کیڑے خود پھولوں سے پیدا کر لیتے ہیں۔

یہہ ظاہر ہے کہ صرف وہی کیڑے جن کے پر اچھی طرح نشو و نما پائے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کی آنکھیں تیز اچھی طرح جمی ہوئی، جن کے حسی اعضا کافی طویل ہوں اور نہایت ہی مہین اور نازک سونگھنے کے عضو سے مزین ہوں وہی پھولوں سے اس قدر قریبی تعلق حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ مکھیاں زیرہ اور پھولوں کا میٹھا رس جمع کرتی اور ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ بعض نہایت ہی دلچسپ تبدیلیاں اور تغیرات خود بخود ان افعال کو انجام دینے کی خاطر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دہن کے دو حصے، جانہ اور علی الخصوص زبان، خاص طور پر ترمیم پا جاتے ہیں تاکہ میٹھا رس حاصل کرنے یا اس کے چوسنے میں مدد ملے۔ ابتدائی حالت میں جو مکھیاں ہوتی ہیں اور جو ان پھولوں پر بیٹھتی ہیں جن میں میٹھا رس کھلا اور ظاہر ہوتا ہے ان میں یہ اعضا نہایت ہی مختصر اور تقریباً زنبور (Wasps) جیسی ہوتی ہیں۔ حالانکہ بعض خاص اقسام میں جو ان پھولوں پر بیٹھتی ہیں جن میں میٹھا رس اندر کسی مقام میں لانبی نلیوں میں پوشیدہ ہوتا ہے زبان اچھی خاصی لانبی ہوتی ہے بعض گرم ممالک کی مکھیوں میں یہ عضو جسم سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

جمع شدہ میٹھا رس معدہ میں جمع کر لیا جاتا ہے اس کے بعد اسے اپنے گھونسلے میں منتقل کر لیا جاتا ہے۔ پوٹا جو غذائی نالی کا اندرونی حصہ ہے بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ تھیلی نما ہوتا ہے اور اس میں یہ خاصیت پائی جاتی ہے کہ وہ پھیل سکتا ہے اس کی دیواریں عضلات سے بنی ہوتی ہیں جس سے مکھی کو اپنے ذخیرگی کی فرونیت میں ملتی ہے یہہ شہد کھلایا جاتا ہے اس لئے کہ میٹھا رس پوٹے میں سے گذرتے ہوئے خامروں کی ایک قلیل مقدار سے مل جاتا ہے

یہہ خامرے (ضمی غدود کا سیال مادہ ہیں جس کی وجہ یہہ میٹھا رس کیمیائی طریق پر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی سکروز SUCROSE یا نئے شکر دوسری شکر میں تبدیل ہو جاتی ہے لیو لوز LEVULOSE اور ڈکسٹروز DEXTROSE کہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ جاذب توجہ وہ طریقے ہیں۔ مکھی کے جسم کی پوری سطح گھنے، استادہ بالوں سے گھری رہتی ہے۔ جو دوسرے کیڑوں کے بالکل برعکس شاخدار ہوتے ہیں یا پرنما ہوتے ہیں جو نہایت آسانی کے ساتھ زیرہ دانوں کو اس وقت تک محفوظ رکھتے ہیں جب تک کہ مکھی ان کو اپنے پیروں سے کنگھی کرنے کے بعد جھاڑ نہ دے۔ متعدد مکھیاں اس طرح سے زیرہ کا ذخیرہ کرتی ہیں۔ یہہ زیرہ تھوڑے سے شہد میں بھیگا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہہ مکھی کے پچھلے جوارح کے ٹبیا (TIBIAE .) اور میٹا ٹارسی METATORSI سے چپک سکتے ہیں، یہہ حصے خاص طور پر چوڑے ہوتے ہیں اور ان پر بڑے لانبے بال بھی ہوتے ہیں جس کی وجہ سے خاص طور پر ایک زیرہ دان بن جاتا ہے جسے CARBICULA بھی کہتے ہیں۔ دوسری مکھیوں میں معدہ کے ظہری جانب زیرہ لگ جاتا ہے جہاں خاص قسم کے بال ہوتے ہیں جو اس کو ٹھوس حالت میں بہت دیر تک تھامے رہ سکتے ہیں۔ اول الذکر قسم کی مکھیاں اس وجہ سے PODILEGOUS اور مؤخر الذکر gastrilegous کہلاتی ہیں۔

چھوٹی مکھیاں جو بالکل ابتدائی قسم کی ہوتی ہیں یعنی پروسوپس Prosopis وہ چھوٹی قسم کے زنبور سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ ان کے جسم برہنہ ہوتے ہیں اور ان کے ضمیمے یا پچھلے جوارح ترمیم یافتہ نہیں ہوتے۔ لیکن یہ مکھیاں جیسا کہ اس سے پہلے اس کا ذکر کیا جاچکا ہے شہد اور زیرہ دونوں نگل جاتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں ان کے معدہ میں پہونچ جاتی ہیں۔ تب اس کے بعد طفیلی مکھیوں کی ایک طویل ضمنی فہرست ہے جو اپنے انڈے گھونسلوں میں دیتے ہیں انہیں صنعتی قسم کی مکھیاں کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ زیرہ مہیا یا منتقل کرنے کے اعضاء رکھیں۔ اس قسم کی مکھیاں تقریباً برہنہ ہوتی ہیں اور ان کی ٹبیا (پیر کی ایک ہڈی) ہڈیاں اس سادہ ساخت کی ہو جاتی ہیں جیسی کہ زنبور میں ہوتی ہے۔ اور بیشک عام طور پر چونکہ نر مکھیاں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں کہ زیرہ جمع کریں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پچھلے جوارح میں کافی ترمیم کو ظاہر کرتی ہیں جب ان کا مقابلہ اس مخصوص قسم کی مادہ سے کیا جاتا ہے۔

پھولوں کے تعلق کے لحاظ سے مکھیوں میں بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض شہد کی مکھی کی طرح اور بعض بھونرے کی طرح ہر قسم کے پھول پر بیٹھتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کو ہرجائی کہتے ہیں Poly Troptic کہا جاتا ہے۔ حالانکہ دوسرے قسم کی مکھیاں نہیں یکجائی oligotropic اپنی توجہ صرف چند مخصوص قسم کے جھاڑ کے پھولوں کی حد تک محدود رکھتی ہیں یا بعض اوقات oligotropic

شاید POLYTROPIC کی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اس کو فائدہ مند پایا کہ دوسری قسموں سے مقابلہ کرنے کی بجائے اپنے نشو ونما کے موسم کو ایک ہی قسم کے پودے کے نشو ونما کے موسم سے ملا دیں اور اپنی کارروائی اسی حد تک محدود رکھیں۔ اس سلسلہ میں ایک بہترین مثال چھوٹی کالی مکھیوں کی ہے جس کا نام Halictoides nove anglias ہے جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک خاص قسم کی بیل کے پھول پر ہی بیٹھتے ہیں جس کا نام Pontederia cordata ہے اور جو نیو انگلینڈ میں پائی جاتی ہے۔

جناب نورالحسن خاں سوز۔ بی۔ ایس۔ سی

آنکھوں ہی آنکھوں میں مستانہ بنا دے ساقی
غرض پیمانے سے مجھ کو نہ میخانے سے

میں ہوں انساں، دو عالم ہیں مرے زیر نگیں
ربط کعبے سے مجھے اور نہ ہے بتخانے سے

خشک میخانے کو کر دیں وہ بلا نوش ہیں ہم
چھلکی ہو گی کسی کم ظرف کے پیمانے سے

ان دنوں باغ میں ہے چھوڑ کے کوہ و صحرا
عشق شاہیں کو ہوا جاتا ہے کاشانے سے

ماسک آتے ہیں نظر چہرے پر اب جائے نقاب
حسن مجبور ہے تہذیب کے دیوانے سے

راز چہرے سے بھی کھلتا ہے زباں کی صورت
آپ پرہیز تو کرتے نہیں شرمانے سے

گر پلانے پہ مصر ہے تو پلا دے ساقی
جو چھلکتی ہے تیری آنکھ کے پیمانے سے

افسانہ

راگ مالا

سروتم اور اُس کا خاندان دولت و امارت کے اعتبار سے مشہور اور ہر دلعزیز نہ تھا۔ بلکہ اُن کے اخلاق و محبت نے سارے گاؤں والوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ اُس کے والد موہن بابو اِس تعلقہ کے مڈیکل آفسر تھے، اُن میں ایثار اور نوعِ انسانی کی خدمت کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا غریبوں کے دکھ درد میں وہ ہمدردی کے ساتھ حصہ لیتے، آدھی رات کو بیماروں کے گھر جاتے، اور خود اپنے ہاتھوں سے دوا بنا کر پلاتے، ضرورت کے وقت پیسے دو پیسے کی مدد کرنے میں وہ کبھی بخل سے کام نہ لیتے، لے دیکے یہی سروتم ان کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا سہارا تھا۔ ماتی ان کی لڑکی آئے دن بیمار رہا کرتی، البتہ اُن کی وفا شعار بیوی اپنے شوہر کی طرح ہنس مکھ خوش خلق، اور مہربان تھی، اپنے ہمسایوں کے دُکھ درد، رنج و غم اور شادی بیاہ میں وہ ہمیشہ پیش پیش نظر آتی تھی۔

ستیش بابو اسی گاؤں کے اسکول ماسٹر تھے، آدمی اپنے دیرینہ تجربات کے باعث خود دار اور محتاط قسم کے واقع ہوئے تھے مدرسہ آنے جانے کے سوا وہ بہت کم باہر نکلتے، یوں تو شباب کے زمانے میں اُن کے یہاں اولاد کی کمی نہ تھی بُرا ہو قسمت کا، پار سال دو تین لڑکیاں اور لڑکے طاعون کے نذر ہو گئے، اب لے دیکے ایک لڑکا اور لڑکی باقی تھے۔ کیلاش پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا، اور ماسٹر کی چھوٹی لڑکی سروجنی جس کو وہ پیار سے سرجو کہہ کر پکارا کرتے تھے، سروتم کے ہم جماعت تھی، تعلیم کے اوقات کے بعد وہ دونوں اکٹھے کھیلا کودا کرتے، یا کبھی مدرسہ کے باغیچہ سے مختلف اقسام کے پھول توڑ کر ہار بناتے، اور خوشی خوشی ایک دُوسرے کے گلے کی نذر کرتے، کسی تعطیل کے دن گاؤں کے باہر جھیل کے کنارے چلے جاتے، چمکیلے خوبصورت کنکر لے کر آپس میں ہیرے موتیوں کی تجارت کیا کرتے ـــــ آہ بچپن کا زمانہ بھی کتنا معصوم اور سہانا ہوتا ہے۔

یونہی دن بیت رہے تھے ـــــ ستیش بابو کی سروس ختم ہو چکی تھی اُن کو وظیفہ پر ملازمت سے سبکدوشی کا حکم آ گیا۔ گاؤں والے ان سے بڑی محبت کرتے تھے رخصت کے وقت اُن کا وداعی جلسہ کیا گیا، ڈاکٹر موہن بابو نے اُن کی تعریف میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی، اُن کے کارناموں کو سراہا گیا۔ سروتم نے بھی ماسٹر کی جدائی سے متاثر ہو کر ایک مختصر سی وداعی نظم پڑھی، اور جب یہ دونوں ننھے دوست آپس میں جُدا ہو رہے تھے، اُن کی آنکھوں سے

"گنگا جمنا بہہ نکلی" سروتم! سرجو نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا "ہمیں بھولنا نہیں کسی وقت ہمارے پاس شہر چلے آیا کرنا" سروتم نے اپنی دوستی کی یادگار قائم رکھنے کے لئے سرجو کو "ایک ربڑ کی گڑیا" تحفۃً دی، سرجو نے سروتم کو ۔ "راگ مالا دیا" یہ تھا دو محبت بھرے اور معصوم دلوں کا پہلا تحفہ ۔

دن گذرتے گئے ــــ ہفتے مہینہ اور مہینے سال کی شکل میں تبدیل ہوتے گئے۔ سروتم نے ابھی ساتویں کلاس پاس کی تھی کہ اُس کے والد دفعتہً فالج کے اثر سے بیمار پڑ گئے ــــ اِس عرصہ میں اُس کی چھوٹی بہن اپنی طویل علالت کے باعث چل بسی ــــ علاج کی خاطر موہن بابو کو حیدرآباد لایا گیا ــــ یوں تو حیدرآباد میں اُن کے کئی ایک دوست اور عزیز و اقارب موجود تھے، مگر ایسی حالت میں وہ سوائے دواخانہ کے کسی کے پاس ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا مگر علاج کے باوجود بھی اُنہیں صحت نہ ہوئی، جسم کا ایک حصہ بالکل فالج سے متاثر ہو گیا تھا۔ سروتم شہر کے ایک گوشہ میں کم کرایہ کا مکان لے کر اپنی ضعیف والدہ اور مفلوج باپ کے ساتھ رہنے لگا، اُسے باپ کی ملازمت اور اپنی تعلیم کے منقطع ہونے کا بڑا قلق رہا۔ جمع شدہ پونجی دو تین مہینہ تک کام آتی رہی، اس کے بعد زیورات اور اسباب کی نوبت آئی، عزیز و اقارب اور دوست احباب نے بھی رسمی طور پر اُن کی تھوڑی بہت مدد کی ــــ شہری فضا میں تین نفوس کا پرورش پانا، کتنا مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے ــــ اب سروتم کو ملازمت کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ بوڑھی ماں اور معذور باپ کی اطاعت گذاری کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا ــــ تھوڑی بہت جد و جہد کے بعد اُسے ایک کارخانے میں معمولی نوکری مل گئی ۔ مزدوروں کی حاضری نویسی کی خدمت پر ماہانہ دس روپیہ کے حساب سے وہ کارگذار ہو گیا ــــ صبح وہ پانچ بجے بیدار ہوتا، اور روکھا پھیکا کھا کر کارخانہ روانہ ہو جاتا۔ مزدوروں کی حاضری اور سامان کی رکھوالی کا کام اُسی کے تفویض تھا۔

سبھی دن گذر جاتے ہیں، وقت کی گاڑی کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے ــــ اِس دو سال کے عرصہ میں کارخانہ والوں نے اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اُس کی تنخواہ دس سے پندرہ کر دی ــــ اور قسمت نے اُس پر اتنی مہربانی اور کی ــــ "والد کا سایہ" ہمیشہ کے لئے اُس کے سر سے اُٹھ لیا ۔ اُس نے ان سب مصائب و آلام کا نہایت صبر و شکر کے ساتھ استقبال کیا۔ اُس کی ماں چند دنوں سے علیل تھی ایک روز دوائی کی خاطر وہ دواخانہ پہونچا ــــ دوا لے کر گھر لوٹ رہا تھا ــ کسی نے اُسے آواز دی ــــ مڑ کر دیکھا مسرت میں ڈوبی ہوئی ایک آہ اس کی زبان سے نکلی ۔

"کیلاش بھیا! ــــ آپ یہاں کہاں؟ ــــ سرجو کہاں ہے ــــ ماسٹر جی اچھے ہیں نا"

"ہاں سب اچھے ہیں، کیلاش نے جواب دیا "تم کہاں رہے" یہ دوائی کس کے لئے، ڈاکٹر چچا تو خیریت

سے ہیں نا"

"چپ کیوں ہو گئے سروتم — بولو — ارے یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو — تم رو رہے ہو — بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے"۔

"کچھ نہیں بھیا! وہ بولا — یونہی دل بھر آیا — بابو مر گئے — مالتی روٹھ گئی — اور ماں بیمار ہے"

"ارے — کب؟ کیلاش نے افسوس کے لہجہ میں کہا — "صبر سے کام لو — دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے ہمارے گھر چلو گے نا" —

"ماں کے لئے دوائی لئے جا رہا ہوں — وہ بولا —

"سرجو سے نہیں ملو گے"۔

"پتہ دے جائیے — کل حاضر ہونگا"

دیئے ہوئے پتہ پر سروتم کیلاش کے گھر پہونچا — مختصر سا خوبصورت باغیچہ سے گذر کر وہ نئی تہذیب سے سجائے ہوئے کمرے میں پہونچا — بوڑھا ماسٹر کرسی پر لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا — اُس نے سروتم کے سلام کا جواب دے کر کہا "بھئی! ہمیں ڈاکٹر کے گذر جانے کا بڑا افسوس ہے، اب کہو، کیا کرتے ہو تم نے کہاں تک پڑھا ہے"۔

"پڑھائی تو کئی سال ہوئے چھوٹ گئی — فیکٹری میں کام کرتا ہوں"۔

"کبھی کبھی اِدھر آ جانا" — ماسٹر نے صرف اتنا کہا، اور بدستور اخبار کے مطالعہ میں محو رہا،

"سروتم! کیلاش نے کہا — "باہر ورانڈے میں چل کر بیٹھیں — چائے پی کر چلے جانا"۔

"سرجو — کہاں ہے؟" — اُس نے دریافت کیا —

"وہ آتی ہوگی — امتحان کی تیاری کے لئے۔ ٹیوٹر سے پڑھنے جاتی ہے۔

"کس جماعت میں پڑھتی ہے وہ" —

"انٹرنس کا امتحان دے رہی ہے" — کیلاش نے جواب دیا۔

"اور آپ — —

"اِس سال — ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان دیا ہے"۔ — دیکھئے وہ آ گئی سرجو — سرجو یہاں آؤ" کیلاش نے اُسے آواز دی — سروتم بابو آئے ہیں" —

اوہ — آپ سروتم — ایک حسن و شباب کا پیکر رنگینوں اور نکہتوں میں ڈوبا ہوا اُس کی مشتاق نگاہوں کے سامنے کھڑا تھا — وہ کھڑا ہو گیا — حیرت و مسرت میں ڈوبی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

ایک لطیف لہر نے اس کے بدن میں گدگدی سی پیدا کردی ــــ

" ارے ــــ آپ ــــ

" تشریف رکھئے " ــــ سروتم نے ملائم لہجے میں کہا ــــ میں ابھی چائے کر آتی ہوں " ــــ چند لمحوں میں تینوں حضرات بیٹھے چائے پی رہے تھے ــــ دفعتہً ہوا میں طوفان سا آگیا، زور وشور سے آندھی چلنے لگی ــــ آن کی آن میں کالے کالے بادل گھر آئے منظر کی اس اچانک تبدیلی پر سروتم گھبرا سا گیا، اُس کے چہرے سے وحشت اور پریشانی سی برسنے لگی چند لمحوں میں بارش ہونے لگی، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے اُسے اور ہراساں کردیا، اُسے بے ساختہ اپنی بیکس بیمار ماں کی حالت یاد آئی، دیوانگی کی حالت میں وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا ــــ ماں! اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بے تحاشہ دوڑتے گیا ــــ

" سروتم! کیلاش نے اُسے پکارا ــــ بارش میں بھیگ جاؤ گے "

" ماں بھیگ رہی ہوگی " یہ کہتے ہوئے وہ بھاگا، وہ اکیلی ہے ــــ مجھے پکار رہی ہوگی

پانی مسلسل پڑ رہا تھا ــــ عناصر میں زبردست جنگ ہونے لگی اُس کے تمام کپڑے بارش سے تر ابور ہوئے بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے اُسے قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا آدھ گھنٹہ کے عرصہ میں وہ گھر پہونچا، مکان کے دونو کواڑ کھلے پڑے تھے، بارش کی بوچھاڑ سے سارا مکان جل تھل ہوگیا تھا ــــ اُس کی بیمار ماں چارپائی پر بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی ــــ اُس کا تمام بدن بارش اور ژالہ باری سے بُری طرح مجروح ہوچکا تھا ــــ تیزی کے ساتھ وہ ماں کی طرف جھپٹا ــــ اور آواز دی ــــ ٹٹول کر نبض دیکھی، مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا ــــ سارا جسم برف کی مانند سرد ہوکر ٹھنڈا ہوگیا تھا ــــ آہ اُس کی ماں بھی اُس سے روٹھ گئی ــــ ایک دردانگیز چیخ فضا میں بلند ہوئی ــــ وہ اپنی ماں کی نعش پر گر پڑا ــــ اور بیہوش ہوچکا تھا کافی دیر کے بعد اُسے ہوش آیا ــــ آس پاس کے کچھ لوگ اُس کے گرد جمع ہوگئے تھے، دیوانگی کی حالت میں اُس نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی، ــــ " تم لوگ کیوں آئے ہو؟ یہاں کیوں آئے ہو ــ میری ماں یہ خاموش کیوں ہے بتاؤ ــــ اِسے کیا ہوگیا، آہ میری پیاری ماں بھی مجھ سے روٹھ گئی " وہ یونہی کچھ دیر تک بڑبڑاتا رہا ــ کچھ لوگ اُسے باہر لے آئے، ــــ اور چند گھنٹوں کے اندر اس کی ماں کو نذر آتش کیا گیا ــــ اب وہ دنیا میں تنہا رہ گیا، ــــ شاید مصائب کی کڑیاں جھیلنے کے لئے ــــ دو تین دن تک اُس نے غم والم میں ڈوبی ہوئی زندگی گذاری، کوئی غمخوار نہ تھا ــــ بات تک کرنے والا میسر نہ آیا ــ گھر میں جو کچھ کھانے پینے کا سامان موجود تھا ــــ وہ تمام ختم ہوچکا، ایک آدھ دن تو اُس نے فاقہ پر پانی پی پی کر گذارا ــــ چھٹے روز جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلا ــــ ناتوانی کے باعث اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا ــ

چہرہ پژمردہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، جیسے کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے ـــــ بمشکل وہ اُٹھتے بیٹھتے کارخانہ تک پہونچا، کئی روز کی غیر حاضری کے باعث کارخانہ والوں نے اُسے برطرف کردیا تھا ـــــ مینجر اور مالک کارخانے سے اُس نے اپنی ماں کے مرنے کی خبر دی ـــــ مگر کسی نے بھی اُس کی ایک نہ سنی ـــــ اور نہ اُس کے حالِ زار پر نگاہِ ترحم ڈالی، مجبوراً اُسے تین چار دن کی اُجرت لے کر گھر لوٹنا پڑا ـــــ وہ دن بھی اُس کا، آہ وزاری میں کٹا ـــــ دُوسرے دن وہ سرجو کے گھر پہونچا ـــــ شاید وہاں کوئی اس کی ہمدردی کر سکے گا، انسان کا دل جب غم وآلام کا شکار بن جاتا ہے۔ ایک ہمدرد انسان کا ہمیشہ متلاشی رہتا ہے ـــــ اُس نے جب اپنی والدہ کے انتقال کی اطلاع سرجو کو دی ـــــ اُس نے بھی اُس کی زیادہ دلجوئی نہ کی ـــــ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا ـــــ " صبر سے کام لو سروتم، دنیا میں ہر شخص مرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے " کیلاش تو کہیں باہر جارہا تھا، صرف سرجو اُس کے پاس بیٹھی رہی ؎

" ہاں تو ـــــ سروتم بابو ـــــ سرجو نے اُس سے دریافت کیا ـــــ آیندہ کیا ارادہ ہے "۔

" مجھے کیا کرنا چاہیئے، سروتم نے پوچھا، ـــــ یہ میں تم سے مشورہ کرنے آیا ہوں "۔

" کہیں نوکری کرلو " ـــــ سرجو نے رائے دی ـــــ

" تم کہہ رہی ہو ـــــ سرجو ـــ وہ بولا۔

" ہاں نوکری کے بغیر چارہ ہی کیا ہے ؟ ـــــ

" ٹھیک کہتی ہو ـــ مجھے تم سے اِس سے زیادہ توقع نہ رکھنی چاہیئے " ـــــ سروتم نے طنزاً کہا ـــــ

" توقع کی بات نہیں، سرجو نے کہا ـــــ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے ـــــ اور زمانہ کا انقلاب ہمیشہ نہیں رہتا " ـــــ

" آہ ـــــ سرجو ـــــ سروتم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ـــــ عہدِ طفلی کی وہ معصوم کہانی ـــــ صفحۂ دل سے محو ہو سکتی ہے "

" ہو سکتی ہے ـــ یہ سرجو کا جواب تھا ـــــ گردشِ زمانہ سب کچھ بھلا دیتی ہے ـــــ سروتم بابو آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ایک سیکل سوار کا کس طرح ایک پیدل مسافر ساتھ دے سکتا ہے ـــــ غور کیجئے گا! دنیا میں سبھی دن اپنے نہیں ہوتے، دھوپ چھاؤں سبھی کے گھر آتی ہے ـــــ صبر وتحمل سے کام لیجئے اور مستقل ارادے کے ساتھ کسی منزل پر پہونچنے کی کوشش کیجئے "

" لیکن سرجو جی ـــــ جب توقع ہی اُٹھ جاتی ہے ـــــ اور اُمیدوں وارمانوں کا خون ہوجاتا ہے تو انسان اندھا ہوجاتا ہے ـــــ منزل تک پہنچنے کے لئے اُسے کوئی راستہ سوجھائی نہیں دیتا ـــــ

پوشش حواس معطل ہو جاتے ہیں ——— یہی خیال بیدار رہتا ہے "

" مجھے آپ کے ساتھ پوری ہمدردی ہے سروتم بابو ——— سرجو بولی ——— " کبھی کبھی ادھر چلے آیا کرو تمہارا دل بہل جائے گا "

" دل بہلائی کا بھی تم نے خوب موقع نکالا ——— سروتم نے طنزاً کہا ——— " آپ کی اس دل نوازی کا شکریہ "
سروتم اب گھر آگیا ——— وہ رات اس کی عجیب کرب و اضطراب میں کٹی ——— صبح جب وہ بیدار ہوا ایک عزم مستقل اس کی آنکھوں میں چمک رہا تھا ———

ایک بار پھر وہ سرجو کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا ——— ملازم کی زبانی معلوم ہوا سرجو مدرسہ گئی ہوئی ہے "
" یہ اپنی بی بی کو دے دینا ——— اس نے ملازم سے کہا ——— اور اپنی قیامگاہ کو لوٹ آیا ———

شام کے وقت جب سرجو اپنے کمرے میں داخل ہوئی ——— ملازم نے اس کے آگے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پیش کی،

" کیا ہے یہ " ——— اس نے تیوری پہ بل ڈالتے ہوئے کہا۔

" کوئی صاحب یہ دے گئے ہیں " ملازم نے جواب دیا،

اس نے فوراً بنڈل لے لیا ——— اور لپٹا ہوا کاغذ نکالا ——— " ارے ! یہ راگ مالا " اس کی زبان سے نکلا،

" کون تھا وہ " اس نے پھر ملازم سے استفسار کیا،

" وہ جو سانولے رنگ کے نوجوان، اس دن بارش میں بدحواس ہو کر بھاگ گئے تھے ———

" سروتم بابو " ——— سرجو کی زبان سے نکلا ———

" جی ہاں ——— وہی "

" یہ کیوں دے گئے ——— کس لئے ——— اس نے اپنے آپ سے سوال کیا، وہ سوچ رہی تھی ——— بہت دنوں کی بات اسے یاد آگئی ——— اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا ——— عہد طفلی کی داستان ——— معصوم محبت کی یادگار ——— " یہ راگ مالا " اس کی ہاتھوں کی گرفت میں تھا ——— کتنا خوبصورت رنگین خواب تھا وہ اس کا دماغ مختلف خیالات کا آماجگاہ بنا رہا ——— دفعتہً اس میں ایک انقلاب سا پیدا ہو گیا ———، وہ اپنی جگہ سے اٹھی ——— اور جلد جلد اپنے کمرے کی فرش ناپتی رہی ——— " سروتم بابو " ——— اس نے آہستہ سے کہا۔ بیچارہ مصیبت زدہ پریشان حال ——— ماں باپ مر گئے ——— نوکری جاتی رہی ——— آہ میں نے بہت ... کیا، جو اس کے غموں میں شریک نہ ہوئی کہ وہ کتنا شریف انسان ہے

مجھے اُس کے ساتھ ہمدردی ضرور ہے ــــ مجھے اب اُس سے معافی مانگنی چاہئیے ــــ گر وہ کہاں ہوگا ــــ میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گی ــــ ابھی۔ اسی وقت "

سروتم دن بھر ملازمت کی تلاش میں پھرتا رہا، مگر بدقسمتی اور ناکامی ہمیشہ سایہ کی طرح اُس کے ساتھ چمٹی رہی آخرکار اُس نے تہیہ کر لیا، مزدوری کرے ــــ ملازمت اور مزدوری میں آخر فرق ہی کیا ہوتا ہے ــــ محنت دونوں میں کرنی پڑتی ہے ــــ ملازم کو مہینہ یا ہفتہ میں ایک مرتبہ اُجرت ملتی ہے ــــ اور مزدور کو ہر دن ــــ اُسی محلے میں ایک صاحب سروتم کے شناسا تھے ــــ جن کے یہاں کئی رکشا کرایہ پر چلتے تھے، سروتم اُن سے ملا اور ایک رکشا کرائے پر لے لیا ــــ رات کے آغاز ہوتے ہی وہ رکشا لیکر گھر سے نکل پڑا ــــ ابھی سرجو چوراہے کے پاس پہنچی تھی کہ ایک رکشا سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی ــــ

" اے رکشا والے ! لڑکی نے دریافت کیا ــــ کرایہ کرو گے "

سروتم آواز پر چونک پڑا ــــ اور ایک ہی نظر میں اُس نے تاڑ لیا کہ کون اُس کی رکشا گاڑی میں بیٹھنے کے لئے ہمکلام ہو رہا ہے ۔

" کہاں جائیں گے سرکار ! " اُس نے اپنے چہرہ کا رُخ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا،

" جہاں ہم کہدیں " لڑکی بولی

" بیٹھ جائیے ــــ رکشا دوڑتا رہا تھا ــــ گھنگروں کی جھین سی آواز فضا میں نغمہ ریز تھی ــــ دفعتہً وہ چلتے چلتے رُک گیا ــــ " کسی تفریح گاہ میں چلوں ــــ

" نہیں " آواز آئی ــــ

" سینما گھر " رکشا والے نے پوچھا ۔

" کہیں نہیں " ــــ

" باغ عامہ ــــ یا حسین ساگر "

بکو مت ــــ لڑکی نے تند لہجہ میں کہا ۔ وہ خاموش ہو گیا ــــ

" کہار گلی کتنی دور پڑتی ہے " ــــ لڑکی نے کچھ دور چلنے کے بعد کہا ــــ

" کہار گلی ــــ وہاں کس کوٹھی پر چھوڑ دوں سرکار " ــــ

بس وہیں ــــ ایک جگہ ــــ

" سروتم بابو ــــ سے ملنے جارہی ہیں آپ " رکشا والے نے پھر بولنے کی جرأت کی،

سروتم بابو ــــ لڑکی نے حیرت کے ساتھ استفسار کیا ــــ تم انہیں جانتے ہو ــــ

" ہاں، ہاں ــــ وہ میرے ــــ نہیں، نہیں وہ کوئی دوسرے ہوں گے" ــــ

" کہاں ہے اُن کا مکان" ــــ لڑکی نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا ــــ

" وہ سامنے والا مکان ــــ جھونپڑی تما ــــ آپ وہاں جانا پسند بھی نہ کریں گی " ــــ

" وہ گھر پر ہوں گے۔ ــ اس وقت " ــــ کسی خیال کے تحت اُس نے سوال کیا ــــ

شاید ــــ لڑکی رکشا سے اتر پڑی ــــ " یہ تمہاری اجرت " ــــ اُس نے اپنے جیب سے چونی نکال کر دیتے ہوئے کہا ــــ

" رہنے دیجئے، میں اجرت نہ لوں گا " ــــ

کیوں ــــ لڑکی نے حیرت سے سوال کیا ــــ

" آپ سروتم بابو کے مہمان ہیں " نا ــــ

" تم بڑے ــــ لڑکی کہتے کہتے رک گئی ــــ دفعتہً اُس کی نظریں رکشا والے پر پڑیں

" ارے ــــ تم ــــ سروتم بابو ــــ وہ ٹھٹک کر رہ گئی ــــ سروتم اگر اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ گر پڑتی، وہ فوراً اُس کے پیروں پر جھک گئی ــــ محبت کے دو انمول موتی اُس کی آنکھوں سے نکل کر سروتم کے قدموں میں گر گئے۔ " سروتم بابو ــــ مجھے معاف کرنا ــــ اُس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا، میں نے تمہیں دکھ پہونچایا ــــ میں تمہاری گنہگار ہوں، تم مجھے جو چاہو سزا دے سکتے ہو، میں نے تمہیں جاننے میں سخت غلطی کی ــــ آخرکار مجھے تمہاری محبت نے یہاں آنے تک مجبور کر دیا۔ تم کتنے اچھے آدمی ہو، جو اس فلاکت اور مصیبت میں بھی دامن استقلال کو تھامے رہے "

سروتم ــــ یہ سب کچھ منظر دیکھتا رہا ــــ اُس کے دل میں بھی محبت کی ایک لہر اُٹھی ــــ اُس نے سرجو کو اُٹھاتے ہوئے کہا، ــ

" خیر، جانے دو ان باتوں کو ــــ صبح کا بھولا ــــ شام کو گھر آ گیا ــــ مجھے مسرت ہوئی کہ تم نے مری اور اپنی زندگی کی کشتی کو غم و آلام کے طوفانی تھپیڑوں سے بچا لیا ــــ مجھے تمہاری ہستی سے بڑی اچھی توقعات وابستہ ہیں تم میری زندگی کی بہترین رفیقہ ثابت ہوگی ــــ سروجی میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں! اس کا جواب ہیں، میرے بہتے ہوئے آنسو ہیں " ــــ

" سروتم ــــ اُس نے اپنے دامن میں، اُن قیمتی موتیوں کو محفوظ کرتے ہوئے کہا ــــ میں تمہاری ہوں، اور عہد کرتی ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک تمہاری بن کر رہوں گی ــــ اچھا ــــ اب اُٹھیے رات

زیادہ ہو رہی ہے ــ پتاجی اور بھیا، گھر پر میرے منتظر ہوں گے ــــــ "مجھے اجازت دیجئے؟"
"میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا ــــــ اس رکشا میں" ــــــ گویا در ہے کہ اس دفعہ تمہیں اُجرت دینی پڑیگی
اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نہیں، سروتم، مجھے اور زیادہ شرمندہ اور گناہگار نہ بناؤ ــــــ اور وعدہ کرو کہ اب کبھی یہ رکشا کا دھندا تو نہ کرو گے؟" ــــــ
"اس شرط پر کہ میں تمہیں گھر پہونچا دوں ــــــ پھر کبھی رکشا کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"
"تمہاری مرضی" ــــــ

ایک سال کے اندر سروتم کیا سے کیا بن گیا ــــــ غم و آلام کے گھٹاؤں میں جب اُمیدوں کا دھندلا ستارہ چمکنے لگتا ہے تو ایک حرماں نصیب مسافر کو منزل کا نشان مل ہی جاتا ہے ــ یہی حال سروتم کا رہا ــــــ اب سرجو اُس کی ہو چکی تھی ــــــ جو زندگی کی کٹھن راہوں کی ساتھی بن کر ایک اچھی مشیر اور غمخوار ثابت ہوئی ــــــ شہر میں بیسوں رکشا گاڑیاں تھیں ــــــ اُن کی درستی اور بنوائی کا کوئی خاص کارخانہ نہ تھا ــــــ سرجو کی مختصر سی مدد کے بدولت سروتم نے ایک چھوٹے سے کارخانہ کی بنیاد رکھی ــــــ مستعدی، دیانت داری اور اخلاق انسان کو روانی سے اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیتے ہیں ــــــ معمولی اُجرت پر بہترین کام کیا جاتا، ایسی ہی چیزوں کی ہر جگہ مانگ ہوتی ہے ــــــ چند ہی مہینوں کی قلیل مدت میں سروتم کے کارخانہ کو کافی شہرت اور ترقی ہوئی ــــــ سوسائٹی میں اُس نے اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا۔
ماسٹر ستیش بابو ــــــ اور ڈاکٹر کیلاش پھر سے اُس پر مہربان ہو گئے ــــــ اور سرجو ــــــ اُس کی رفیقہ حیات ــــــ حقیقی معنوں میں اب وہ منزل کا نشان پا گیا تھا۔
"حیات کی منزل طے کرنے کے لئے انسانی گاڑی میں مرد اور عورت کا ہونا لازمی ہے۔"

صابر کوسگوی
حیدرآباد دکن

پونا کالج کا واقعہ ہے۔ جبکہ احمد۔ خورشید۔ تارہ۔ شہناز ایک ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تارہ اور خورشید۔ احمد کو اس وجہ سے چاہتے تھے کہ وہ ایک اچھے دماغ کا طالب علم ہونے کے علاوہ کالج کے عام نوجوان طلبار کی طرح حسن و عشق کی گہرائیوں کا جائزہ لینے کے لئے بیقرار نہ رہتا تھا —— گرمائی تعطیلات کے شروع ہونے سے پیشتر کلاس کی جانب سے پکنک منائی گئی، شام کی خنک ہوا اور دریا کی قربت نے مناظر میں دلکشی پیدا کر دی تھی۔ احمد کے فطرت آشنا ساتھی خورشید۔ اور تارہ کے چہرے فرط مسرت سے گلابی ہو رہے تھے۔ طویل قہقہے۔ قلبی مسکراہٹیں ماحول میں ایک کیف پیدا کر رہے تھے۔ مگر ——— ایک بیقرار دل کسی کو حسرت بھرے ارمانوں کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا —— احمد اپنے وطن آگیا۔ اُسے ایک خط ملا —— شاعرانہ جذبات سے پاک ادب کی رنگینیوں سے کوسوں دُور ۔۔ مگر ۔۔ محبت و خلوص کے سچے جذبہ کا حامل ۔ ۔۔ خاموش محبت پیغامبر بن کے آئی تھی ۔۔ شہناز نے التجا کی تھی کہ احمد کالج کی طرح محبت کی دنیا میں بھی اشتراک کرے ۔

حبیب محمد
حیدر آبادی

میرے احمد!

لیک یو پونا فروری ۱۹۴۲ء

میری تمنائیں تمہیں سلام کہتی رہیں۔

کیا کیفیت بیان کروں ان چند لمحوں کی جو ہم نے آسمان والوں (خورشید۔ تارہ) اور آپ کی محفل میں گذارے ہم تو اس محفل میں کچھ کھو سے گئے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ کچھ دیر اور یہی سماں پیش نظر رہے۔ مگر کہاں تھے ایسے نصیب — یہ بھی آسمان والوں کی مہربانی تھی جو اس نورانی محفل میں بٹھا کر میری قسمت کو چمکا دیا۔ اور آج تک اس محفل کے کیف کو فراموش نہ کر سکی۔ جو چند لمحوں کے لئے میسر آیا تھا۔

مگر—— آپ کی محبت بھری نگاہ نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس ناچیز پر التفات نہ کی۔ رات قریب الختم ہے۔ احمد اب میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں، ایسے وقت میں جبکہ صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی اور پھر شب کے جاگے ہوئے تاروں نے اپنی نیم باز مستانہ آنکھوں سے اشاروں ہی اشاروں میں خورشید سے کچھ کہدیا۔ اور جب اس نے اپنی نور کی چادر سے سر نکالا۔ تو وہ تاروں سے محو گفتگو ہو گیا —— ایک طرف صبح کا پیغامبر خورشید اور دوسری طرف جھلملاتے ہوئے تارے —— نہ جانے کیا باتیں ہوئیں۔ اچھے احمد میں خورشید۔ اور تارے کی تعریف کرنے سے قاصر ہوں میں کن الفاظ اور جملوں میں اپنے جذبات دل کی تصویر کھینچ کر پیش کروں — نہ تو میرے پاس ڈکشنری ہے اور نہ اتنا کاغذ۔" اچھے احمد! تم نے تو خوب لکھا کہ "لکھتے وقت لکھنے کی باتیں بھول رہا ہوں" بھلا خورشید اور صبح کے تاروں کی روشنی میں بھی کہیں انسان اپنا راستہ بھول سکتا ہے۔ میں آپ کے جذبات کو سمجھنے کے باوجود یہ کہونگی کہ آپ مطمئن رہئیے — شہناز آپ کی باتوں کا کبھی برا اثر نہیں لیتی —— وہ تو محبت کو ایک نتیجہ خیز حادثہ سمجھ کر اس پر دل کھول کر ہنستی ہے — یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ آ رہے ہیں، مگر یہ نہ پوچھیے کہ آپ کی آمد و رفت سے میرے دل و دماغ کے کیسے احساسات ہوتے ہیں

ہاں، ایک بات! میں نے خط بھیجنے میں تاخیر کی —— اس تاخیر کے لئے بے تکلفانہ معافی چاہتی ہوں، میں ہنس چاہتی کہ اپنی غلطی کو تکلفات کے غلاف میں لپیٹ کر آپکے سامنے پیش کروں، صاف کیوں نہ کہدوں کہ میری غلطی سے دیر ہو گئی —— میں انتہائی بے تکلفی سے لکھتے ہوئے اس جملے کی "شہناز میں نے تمہیں معاف کر دیا" پہلے خط میں منتظر رہونگی۔ براہ کرم اس جملے کو طویل نہ کیجئے اور نہ شکوہ و شکایت کا باب کھولئے۔ میں بڑی امید و یقین کے ساتھ تمہارے دلچسپ خط کے دیکھنے کا انتظار کرتی رہونگی۔ اچھا خدا حافظ فقط

آپکی شہناز

رباعی

ہے موسم ماہتاب ساقی ساقی
ایسے میں پلا شراب ساقی ساقی
ہر سانس کے ساتھ یہ صدا ہے پیدا
تسکین وہ اضطراب ساقی ساقی

اختر رشیدی

دو بہترین کتابیں

گاڑی

گاڑی :- شاہد صدیقی اکبرآبادی کے دلکش افسانوں کا مجموعہ

اگر آپ فطری نقوش کو نمایاں طور پر دیکھنا چاہتے ہیں اور قدرت کے دلکش مناظر سے محفوظ ہونے کا شوق رکھتے ہیں تو گاڑی ___ کا مطالعہ ضرور فرمایئے۔

گاڑی افسانوی رنگ میں آپ کے سامنے ان معلومات کا انبار لگا دیگی جن کو حاصل کرنے کے لئے آپ مضطرب رہتے ہیں ___

عنقریب طبع ہو رہی ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت (عہ) ایک روپیہ

آبشار

آبشار :- صابر کوہکوی کے بہترین افسانوں کا مجموعہ

کتاب کے نام سے ہی اس کی دلکشی ظاہر ہو رہی ہے۔

اس افسانوی دنیا میں آپ اپنی آنکھوں سے، طویل قہقہے دلسوز آہیں، دردناک مناظر۔ اور ایثار و الفت کو ان کے صحیح رنگ میں دیکھیں گے ___ آپ اپنا نام فوراً رجسٹر کروالیں۔ تاکہ آپ کو دوسرے اڈیشن کا منتظر نہ رہنا پڑے ___

کتابت و طباعت کے منازل طے کر رہی ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت (عہ) ایکروپیہ

منیجر

ادارہ ارم سلطنت منزل سیف آباد حیدرآباد دکن

۱ ارم ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا۔

۲ اگر ارم پندرہ تاریخ تک وصول نہ ہو تو شکایتی خط ۲۰ تاریخ تک دفتر پر وصول ہونے پر دوسرا پرچہ روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایتی خط کا لحاظ نہ کیا جائے گا۔ اور پرچہ قیمتاً خریدنا ہوگا۔

۳ ارم میں مضامین کی اشاعت بالکلیہ مدیر کی مرضی پر منحصر ہوگی۔

۴ جو مضامین شائع نہ کئے جائیں (۲/) دو آنے کے ٹکٹ آنے پر واپس کئے جا سکیں گے۔

۵ ناقابل اشاعت مضامین ۲ ماہ تک محفوظ رکھے جائیں گے۔ اس کے بعد دفتر ان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

۶ جو مضامین مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے وصول ہوں گے وہ اسی مہینے کے پرچے میں شائع کئے جا سکیں گے۔

۷ ارم میں صرف علمی۔ تفریحی۔ حرفتی۔ صنعتی۔ سائنسی۔ تاریخی۔ معاشرتی۔ فلسفیانہ مضامین شائع کئے جائیں گے۔

۸ اشتہارات کی اجرت بالکلیہ پیشگی ہوگی۔ جب تک رقم دفتر میں نہ پہنچ جائے کوئی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۹ خلاف تہذیب اشتہارات کسی اجرت پر بھی شائع نہ کئے جائیں گے۔

اغراض و مقاصد

صحیح اردو کی ترویج،
ملک کے نوجوان طبقے کے جذبات کی صحیح رہنمائی،
مخرب الاخلاق اور بے معنی قصص کا تدارک
ملک کے نوجوان ادبا کی حوصلہ افزائی۔
معاشی حالات کے متعلق صحیح مشورہ

مطبوعہ انتظامی پریس